نفیس عباسی
کوڑی سے کروڑ تک
(سوانحی خاکہ)
رائے پوری
نیو بازار، بھوپال، مدھیہ پردیش

نفیس عباسی

کوڑی سے کروڑ تک

(سوانحی خاکہ)

خالد رائے پوری

ٹریٹمنٹ پبلیشرز، نیو بازار، بھوپال، مدھیہ پردیش

نامِ کتاب : نفیس عباسی۔ کوڑی سے کروڑ تک

مصنف : خالد رائے پوری

سالِ اشاعت : دو ہزار تین ۲۰۰۳

ناشر : ٹریٹمنٹ پبلیشرز

نیو بازار، بھوپال، مدھیہ پردیش

تعداد : ایک ہزار

قیمت : -/۱۰۰ روپے

کمپوزنگ : فیصل گرافکس

163-A گلی گڈریان

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔ 110013

انتساب

بہ صد خلوص و احترام

اہلِ امروہہ

کے

نام

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر

حرفِ آغاز

''نفیس عباسی ــــ کوڑی سے کروڑ تک'' ایک ایسے شخص کی زندگی کی کہانی ہے جس نے زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ اُس نے نہ صرف جینے کا ہنر سیکھا بلکہ زمانے بھر کو یہ پیغام بھی دیا کہ

ع اگر ہو جستجو کامل تو منزل مل ہی جاتی ہے۔

امروھہ کا سپوت تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ وہ لعل ہے جسکی چمک سے ایک عالم کی نگاہیں خیرہ ہیں۔

ناچیز کی اس کاوش کی اہمیت اس سیاق میں مسلم ہو جاتی ہے کہ جس شخص کی زندگی کا ایک خاکہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ اس قوم سے تعلق رکھتا ہے جو آج بھی حال و مستقبل کو درکنار کرتے ہوئے ماضی کی ہوش ربا بلند و بالا فصیلوں پر اپنے وجود کا پرچم لہرانے میں یقین رکھتی ہے، جو عہد حاضر کے تمام نظاموں سے بیزاری، سائنسی علوم سے عدم دلچسپی اور معلومات و غالب رجحانات سے لاتعلقی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی۔ یہ فرد اس جامد و ساکت معاشرے سے تعلق رکھتا ہے جہاں زندگی کے سلگتے ہوئے مسائل کا حل آج بھی

زبانی جمع خرچ کے ذریعے تلاش کیا جاتا ہے۔

محمد نفیس عباسی کے نام سے پہچانے جانے والے شخص کی یہ کتھا لاکھوں انسانوں کی اس بھیڑ میں انوکھی جد جہد کی مثالی داستان ہے۔اگر عباسی صاحب کی پیدائش کسی نواب، راجہ،تاجر یا کسی اعلیٰ سیاسی شخصیت کے گھر ہوتی اور وہ تجارت میں اتنی بلندیوں تک جاتے تو یہ بڑی عام سی بات ہوتی لیکن انہوں نے ایک انتہائی افلاس زدہ گھرانے میں آنکھیں کھولنے کے باوجود کا رزارِحیات میں اپنا ایسا مقام بنایا ہے جولائق ستائش وقابل مبارکباد ہے۔دوسرا اہم پہلوان کی سماجی کاموں میں دلچسپی ہے،خدمتِ خلق کا جذبہ ہے۔

یہ کتاب اُن لوگوں کے لئے کافی اہمیت رکھتی ہے جوزندگی میں کسی مثالی شخصیت کی تلاش میں رہتے ہیں۔تاریخ عالم ہمیں بتاتی ہے کہ عظیم شخصیتیں آنے والی نسلوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں،نسلیں اُن شخصیتوں کو اپنے لئے آئیڈیل مانتی ہیں۔ایسی شخصیتیں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔اور جستجو آور ذہنوں کے لئے توانائی کا منبع ثابت ہوتی ہیں۔

عباسی صاحب کی زندگی کا یہ مختصر خاکہ اُن لوگوں کے لئے ایک نشانِ راہ ہے جو مسلسل محنت،لگن اور قربانی کا جذبہ رکھتے ہیں۔عباسی صاحب ایک

آئیڈل شخصیت اُن لوگوں کے لئے بھی ہو سکتے ہیں جو غربت و افلاس میں اپنی آنکھیں کھولتے ہیں اور آنکھوں میں سُنہرے خواب لئے کارزارِ حیات میں قدم جمانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ جدو جہد پر آمادہ و مُصر اس طبقہ کے سامنے عباسی صاحب کی سنگھرش بھری زندگی ایک مثال ہے۔ ایک روشنی ہے۔

علمائے سماجیات اس حقیقت سے واقف ہیں کہ آج جنوب ایشیائی ملکوں میں جدو جہد کرنے والا طبقہ ایک بڑی تعداد پر مشتمل ہے۔ قریوں سے شہروں کی جانب رواں دواں یہ قافلہ ایک عظیم انقلاب کا اشارہ دے رہا ہے۔ اہلِ نظر پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہر دور میں انقلاب، ظلم و افلاس کے شکار طبقہ کے کاندھوں پر سوار ہو کر آتا ہے۔ جنوب ایشیائی ملکوں خصوصاً بنگلہ دیش، نیپال، پاکستان اور ہندوستان میں یہ طبقہ بڑی سُرعت کے ساتھ اُبھر رہا ہے۔ اس کے آگے بڑھنے کے واضح اشارے مل رہے ہیں۔

سیاسی ماہرین کا خیال ہے کہ دو ہزار بیس (۲۰۲۰ء) تک اس انقلاب کی صورت واضح ہو جائے گی۔ صارفیت نے جس بے رحم معاشرے کو جنم دیا ہے اس کا انجام شکست و ریخت ہے۔ میڈیا کے ذریعے چلائی جارہی مضوعی بحثیں، زبردستی تھوپی جارہی جنگیں، معاشرے کے سامنے کھڑے کئے جارہے

نقلی سوال ایک نہ ایک دن دم توڑ دیں گے اور پھر واضح ہو گی حقیقت۔ کبھی نہ کبھی تو ختم ہوگا ذہین وفطین دماغوں کو الجھانے کا دور؟ کبھی نہ کبھی تو عام آدمی دیکھ پائے گا دنیا وحالات کی مکمل تصویر؟ آخر کب تک چلتا رہے گا بحث کا یک رُخا پن؟ کب تک ہم ذاتوں، طبقوں، مذہبوں، جرگوں اور قبیلوں میں تقسیم ہوتے رہیں گے؟

یہ کتاب ان سوالوں کا جواب نہیں دیتی ہے۔ یہ کتاب اُن رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے جو وقت اور زمانے کی سمت ورفتار کی تفہیم میں مدومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ محنت اور لگن کامیابی کی کُنجی ہے، ساتھ ساتھ زمانے کے چلن اور رویّوں کو جاننا بھی ضروری ہے۔ یہ کتاب اس بات کے واضح اشارے دیتی ہے کہ کسی بھی تقریر، تحریر اور تعمیر کی تنقیص انتہائی آسان کام ہے۔ جنہیں دنیا میں بڑے کارنامے انجام دینے ہوتے ہیں وہ اپنے نصب العین پر نظر رکھتے ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں یا عیب جوئی یا محض تنقیص میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے، وہ حقائق کو نظر میں رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ سفر میں ہر ہر قدم پر چاق و چوبند رہتے ہیں۔ اپنی توانائی کو پہچانتے بھی ہیں اور اس کی قدر بھی کرتے ہیں۔ جناب فاروق ارگلی کی اصطلاح ہیں وہ بے جا ''خرچ'' نہیں

ہوتے۔

یہ کتاب ایک آئیڈیل شخصیت کی شناخت بھی ہے اور تلاش بھی۔ دنیا میں لاکھوں، کروڑوں لوگ پیدا ہوتے ہیں، اپنے مقدر کا رزق حاصل کرتے ہیں اور آخر بڑے بڑے دعووں اور وعدوں کو خلاء میں جھولتا چھوڑ کر عدم آباد کے سفر پر چلے جاتے ہیں کبھی نہ لوٹنے کے لئے۔ اُن میں سے بعض کوٹھیوں، کاروں اور بینک بیلنس حاصل کرنے کی کوشش کرتے کرتے تصویر بن کر بڑے فریم میں قید ہو جاتے ہیں، زمین اپنی جگہ سالم رہتی ہے۔ جہاں پر کل کنواں تھا وہاں اب ممکن ہے کوئی فلک بوس عمارت کھڑی ہو جائے اور جہاں پر کل عظیم الشان قلعے و محلات تھے وہاں اب کھیتی باڑی ہوتی ہو۔ ہوسکتا ہے دریا کا رُخ بدل جائے۔ کل جہاں جمنا کی تیز دھارا دیکھنے کو ملتی تھی اب وہاں بڑے بڑے مکانات سر اٹھائے تاریخ و تہذیب کی ایک نئی کہانی سُنا رہے ہیں۔

جھوٹ اور سچ کے درمیان آدھے سچ کا ریاض کرتے کرتے نہ جانے کتنے ریاض بھیڑ میں گُم ہو گئے بے چہرہ و بے شناخت۔ اور کتنے ہی مغرور و مجہول سلطانوں کو وقت نے تاریخ کے کوڑے دانوں کے سپرد کر دیا! کس کس کو روئیے، کس کس کا نوحہ لکھئے! وہ لوگ جنکی زندگی کل تک تزک واحتشام کا

نمونہ تھی، منوں مٹی تلے ایک ان دیکھے عالم میں پہنچ گئے۔ جہاں کی خبر لانے والا کوئی نہیں۔

آنے والا کل ہمارا نہیں، کسی اور کا ہوگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انداز بھی بدلے گا اور اندازِ فکر بھی۔ جن لوگوں نے معمولی شکل وصورت کے عباسی صاحب کو دیکھا ہے کل اُن کے اس جہانِ فانی سے کوچ کرنے کے بعد یہ تحریر بھی شاید چند صدیوں تک زندہ رہے!! کیونکہ بہت ممکن ہے کہ چند صدیوں بعد اردو کا بھی وہی حشر ہو جو لاطینی، پالی، پراکرت اور اپ بھرنش کا ہو چکا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی طوفانِ نوح یا کوئی ایٹمی دھماکہ اس پوری انسانیت وتہذیب کے تمام نقوش ہی مٹا ڈالے!!

خدشات وامکانات کے اس لامتناہی سلسلے کے باوجود ہیچمدان کی یہ تحریر اگر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے تو صرف اس امید پر کہ یہ کسی کوڑی والے کو کروڑ تک کا سفر پر مائل کرے گی محنت اور لگن کے بل بوتے پر۔ یہی اس کی کامیابی ہوگی۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ

ہر طرف بھیڑ ہے مہتاب طلب لوگوں کی
ہم کو اندھیرے میں جگنو کا سہارا ہے بہت

شجرہ

ابوالکلام صاحب
↓
اکبر علی صاحب
↓
ہدایت اللہ صاحب
↓
ثناء اللہ صاحب
↓
عبدالرحمٰن صاحب
↓
محمد یوسف عباسی (والد)
↓
بیگم بتول فاطمہ عباسی (والدہ)
↓

Scanned by CamScanner

مختصر سوانحی خاکہ

نام : محمد نفیس عباسی

والد کا نام : محمد یوسف عباسی

مقامِ ولادت : محلہ سرائے کُہنہ، امروہہ

تاریخ ولادت : ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء

بنیادی تعلیم : امام المدارس، محلّہ بگلہ، امروہہ

: مڈل اسکول، پریسیڈنٹ اسٹیٹ، نئی دہلی

ہائی اسکول : پرکاش کالج، پہاڑ گنج، نئی دہلی

ہائر سکنڈری : پنجاب یونیورسٹی

• چھ سال تک امروہہ واقع امام المدارس میں تعلیم حاصل کی۔ ماں ٹی بی کی مریضہ تھیں۔ علاج کے لئے دہلی آنا پڑا۔ اُن کے والد صاحب کی مولانا ابوالکلام آزاد سے اچھے مراسم تھے۔ لہٰذا ہمایوں کبیر صاحب کی رہائش گاہ کے ایک بیت الخدّام (سرونٹ کوارٹر) میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ وہیں ہمایوں کبیر صاحب کی دختر لیلیٰ کبیر کی نظر اس دس۔ گیارہ سال کے لڑکے پر پڑی اور انہوں نے ازراہ ہمدردی پریسیڈنٹ اسٹیٹ واقع اسکول میں

داخل کرادیا۔ وہیں سے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔

- ۱۷سال کی عمر میں ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کیا۔
- ۱۹۵۸ میں انڈین ایئر لائنز کے انجینئر نگ شعبے میں ملازمت کی ابتدا کی اور دس برسوں تک انتہائی محنت و لگن کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیتے رہے۔
- انڈین ایئر لائنز میں ملازمت کرتے ہوئے ایکسپورٹ کے میدان میں قدم رکھا۔ ۱۹۷۷ میں رینو کا ایکسپورٹ پرائیوٹ لمیٹڈ کمپنی کی بنیاد ڈالی جسے ۱۹۷۹ میں حکومتِ ہند کے ذریعے ''ایک اسٹار ایکسپورٹ ہاؤس'' کی سند ملی۔
- اب سے پندرہ سال قبل امروھہ میں طالبات کے لئے ایک کالج بنانے کا خیال آیا۔ گذشتہ دس بارہ سالوں کی انتھک محنت کے نتیجے میں کالج کے لئے ایک سو سات بیگھے زمین پر مشتمل ایک قطعہء اراضی حاصل کیا گیا جہاں اب ''نایاب عباسی گرلز ڈگری کالج'' کی شاندار عمارت عباسی صاحب کے خوابوں کی تعبیر کے طور پر علم کے ایک حسین مرکز کی شکل میں موجود ہے۔

گیارہ سال کی عمر سے غربت و افلاس کے خلاف ایک مسلسل لڑائی، عباسی صاحب کی زندگی کی ایک شناخت ہے۔ بیڑی بنانے، سرکاری دفتروں

میں پینے کا پانی سپلائی کرنے ،اور فارغ اوقات میں ریڑھی لگانے جیسے معمولی کام بھی عباسی صاحب نے بڑی لگن کے ساتھ انجام دیئے۔

امروہہ پر ایک نظر

امروہہ کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ یہ وہ مردُم خیز خطّہ ہے جہاں تاریخ ساز شخصیتوں نے جنم لیا۔ مرادآباد سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع یہ شہر اپنے دامن میں ایسے ایسے نایاب گوہر چھپائے ہوئے ہے جو اپنی تابنا کی سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ شہر مذہبی رنگا رنگی، یکجہتی، اُنس واخوت اور ادبی وثقافتی دولت سے مالا مال ہے۔ ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی سے یہ شہر ایک سوتیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ دہلی سے لکھنؤ کی قومی شاہراہ پر گجروالا سے بیس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے جویا اور جویا سے آٹھ کلومیٹر پر واقع ہے امروہہ۔ اب تو دہلی سے مختلف ریل گاڑیاں امروہہ رُکتے ہوئے مرادآباد اور دہرہ دون تک جاتی ہیں۔ گذشتہ چند برسوں سے ایکسپریس ہائیوے کی تعمیر کا کام جاری تھا جو اب مکمل ہو چکا ہے جس کے نتیجہ میں موجودہ شاہراہ ایک مثالی شاہراہ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بذریعہ کار یہ سفر انتہائی آسان، محفوظ اور خوبصورت ہو گیا ہے۔ عباسی صاحب کا آبائی وطن امروہہ ہے۔ حالانکہ وہ دہلی میں مستقل طور پر مقیم ہیں لیکن امروہہ میں اب بھی اُن کا آبائی مکان موجود ہے جہاں وہ گاہے بہ گاہے آتے جاتے رہتے ہیں۔ نایاب عباسی گرلز ڈگری کالج کے قیام کے بعد سے عباسی صاحب تو اتر کے

ساتھ امروہہ جاتے ہیں۔ کالج کی دیکھ بھال کے علاوہ مختلف سماجی وادبی تنظیموں سے وابستگی عباسی صاحب کو کشاں کشاں امروہہ لئے جاتی ہے۔ بچپن کے بعد ایک طویل وقفہ عباسی صاحب کی زندگی میں ایسا ہے جب وہ کسبِ معاش کی مصروفیتوں میں امروہہ کی ادبی وسماجی گہما گہمی سے الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ عباسی صاحب نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ تجارتی سرگرمیوں میں مختلف ممالک میں سفر کرتے ہوئے گذارا ہے۔ مسلسل پچاس سال کی محنت کے طفیل وہ اپنے بزنس کو اونچائیوں تک لے گئے ہیں اور اب ایک بار پھر وہ امروہہ کی سماجی وتہذیبی زندگی کا ناگزیر حصہ بن گئے ہیں۔ جب وہ امروہہ کے اپنے پرانے دنوں کو یاد کرتے ہیں تو اُن کی آنکھوں میں ایک بجلی سی کوند جاتی ہے۔ یادوں کے بہارستان میں گلگشت کرتے ہوئے وہ بہت دور تک چلے جاتے ہیں۔ اُنہیں وہ ساتھی، وہ لوگ یاد آتے ہیں جن کے ساتھ اُن کا بچپن بیتا تھا۔ وہ بزرگ یاد آتے ہیں جن کی باتیں جلالی اور کردار مثالی تھے۔ علماء اور دانشوروں کا ایک قافلہ دکھائی دیتا ہے۔ علمی مجالس، گھر گھر کا کلچر تھا۔ ادب وشعر کی جستجو، علم وفن کے تذکرے مذہبی سرگرمیاں، ہندوستان کے نامی گرامی علماء وشعراء کی امروہہ

آمد کچھ ایسی ہی باتیں ہیں جو امروہہ کو امروہہ شریف بناتی ہیں۔ایک دبستان کا درجہ عطاء کرتی ہیں۔

عباسی صاحب جب امروہہ کا ذکر کرتے ہیں تو کئی بار شدت جذبات سے اُن کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔لیکن بیان میں حقیقت کے عناصر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا ہے۔اُن کے بیان سے ایسا لگتا ہے جیسے اُن کے ذہن نے بڑی بے باکی اور خوبصورتی کے ساتھ اپنے دور کی ویڈیوگرافی کی ہو۔ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتا ہے۔وہ کہتے ہیں ''تب کے امروہہ اور آج کے امروہہ میں بڑا فرق ہے۔ایک تاریخ ہے جو بیت گئی۔ ایسے ایسے درخشاں ستارے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں کہ زبان، بیان سے قاصر ہے۔کیسے کیسے لوگ اور اُن کے جلالی و جمالی روپ! اب کہاں ہیں وہ لوگ جو کسی ایک نکتہ پر بحث کرتے ہوئے سارا سارا دن اور ساری ساری رات کالی کر دیں۔علم کی ایسی جستجو آج عنقا ہے۔چاروں طرف ماحول میں ادب و شعر کے چرچے تھے۔ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مذہب و ثقافت کی باتیں اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں لیکن رواداری و یکجہتی کا یہ عالم کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے سے سگے بھائیوں سے بھی زیادہ آپس میں پیار

کرتے تھے۔ وہ مہرتاب و شفیق چہرے جو پیوند خاک ہوگئے اب کہاں، دوسروں کی خاطر جینے والے، دوسروں کے غموں کو اپنا غم سمجھنے والے چلے گئے!

سن سینتالیس میں ملک کی سیاسی تقسیم اور جبری مہاجرت سے ہندوستان کی مُسلم آبادی، اور تہذیبی زندگی بُری طرح متاثر ہوئی۔لاکھوں لوگ اپنے بزرگوں کی وارثتوں کو تیاگتے اور نئی زمینوں میں اپنی منزل تلاشنے پر مجبور ہو گئے۔ امروہہ بھی اس سے اُچھوتا نہیں رہ سکا۔ یہاں سے بھی سینکڑوں خاندانوں نے مہاجرت کی اور پاکستان میں پناہ لی۔گذشتہ نصف صدی میں پاکستان جا بسنے والوں میں پُرکھوں کی زمین، روایت اور اُن کی یادوں کو اپنے سینے میں بھینے، سمیٹنے کے جذبے نے سر اُبھارا ہے۔ادب و شاعری میں بھی رقت انگیز لے اونچی ہوئی ہے۔لیکن وقت کے ساتھ اہل امروہہ نے بھی جینے کا گُر سیکھ لیا ھے۔بدحالی دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی ہے۔معیشت کے استحکام کے ساتھ ساتھ چہرے رونق افروز اور آنکھیں روشنی سے معمور ہونے لگی ہیں۔ مکانوں کی مرمّت و تعمیر کا منظر خوشنما ہے۔اریب قریب کے شہروں میں روزگار کے مواقع تلاشنے کے علاوہ بیرون ممالک کا سفر طئے کرنے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔

تعلیم کے حصول کا رجحان بھی قدرے مثبت ہوا ہے۔ حالات بدل رہے ہیں۔ ملک کی سیاسی ناہمواریوں کے باوجود اہل امروہہ زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے اور امن وسکون کا روایتی معیار قائم رکھنے میں کوشاں ہیں اور اب تو امروہہ، جیوتی با پھولے نگر کے نام سے ضلع میں تبدیل ہو گیا ہے۔ حکومتی سطح پر ضلع کی تشکیل اپنی وسیع لمعانی کے ساتھ وجود پذیر پر ہوتی ہے۔ ضلع کے ترقیاتی پروگراموں کا عوام پر ظاہر ہے کہ مثبت اثر پڑتا ہے۔ زرعی و معاشی ترقی کے وسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ جدو جہد زندگی کی نئی راہیں میسر ہوئی ہیں۔ گویا دنیوی نقطۂ نظر سے کامیابی اہلِ امروہہ کے قدم چومنے والی ہے لیکن ... قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ ان جگمگاہٹوں کے دوش بہ دوش خود غرضی، مکاری، لالچ اور بد باطنی بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ کالی سڑکیں اپنے ساتھ شراب وصارفیت لے کے آتی ہیں دنیا بھر میں خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں ترقی کا یہی چہرہ سامنے آیا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کم وبیش یہی سب کچھ ہورہا ہے۔ ٹوٹنے والی شاخ چاہے روایت کی ہو یا جدیدیت کی، محض آندھی کو ذمہ دار قرار دے کر بری الذمہ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ہوائیں شاخوں کو لچکنا سکھا دیتی ہیں۔ اشارۃً عرض کردوں کہ ہم حالات

کے ساتھ موافقت کی ترکیبیں سیکھ رہے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی اصطلاح
میں ابن الوقت بن رہے ہیں۔ یہ شکست کی آواز نہیں، غیر جانب دار تجزیہ ہے
شاعر نے کس خوبصورتی سے یہ موتی پروئے ہیں۔

''کہیں حریفوں میں ایسی ادا بھی ملتی ہے۔
گلے چراغ سے آکر ہوا بھی ملتی ہے۔''

عباسی صاحب کے یہ الفاظ کبھی کبھی انتہائی فلسفیانہ معلوم ہوتے ہیں
لیکن ان میں بڑی سچائی ہے۔ اب ایسے دل کا کیا کرے کوئی جو ترقی کی
بلندیوں کے ساتھ ساتھ اپنی روایتوں کی تقدیس کا بھی قائل ہو۔ یہ معاملہ صرف
عباسی صاحب کا نہیں، ہر سچے انسان کا معاملہ ہے۔ یہ ایسا اضطراب ہے جو
اچھے اچھوں کو چین کی سانس نہیں لینے دیتا ہے۔ انسان کیا کرے؟ آخر فطرت
بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔!!

تغیر و تبدل وقت کا مزاج ہیں۔ انقلابِ زمانہ سے کچھ باتوں و
رواجوں کی اہمیت بڑھتی ہے تو کچھ کی کم ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں ہی زندہ رہ
پاتی ہیں جو وقت کے ساتھ اپنا ناطہ مضبوطی سے تھامنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔
عباسی صاحب کا مشاہدہ قابلِ تحسین ہے اور لائق صد احترام بھی، بدلتے

حالات اور موسموں کے رنگوں کی وہ نہ صرف شناخت رکھتے ہیں بلکہ ایک اچھے نباض کی مانند دھڑکنوں کی پرکھ اور سمجھ بھی رکھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے۔'' تبدیلی وقت کی ضرورت بھی ہے اور معاشرے کی حقیقت بھی۔ ہر نسل اپنے عہد کی ضرورتوں کو قدرے آسانی سے سمجھتی ہے اور خود کو درپیش حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اہلِ امروہہ نے ہر دور میں اپنے وجود کا احساس کرایا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں سرزمین امروہہ سے تعلق رکھنے والی سیکڑوں ہستیوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

آج بھی جدید ہندوستان کی تعمیر میں اہلِ امروہہ کا ایک اہم کردار ہے۔ تجارت، ملازمت، زراعتی اور تعلیمی میدانوں میں اپنے تشخص کو محفوظ رکھتے ہوئے یہاں کے لوگوں نے بڑی بڑی ذمہ داریوں کو نبھایا ہے۔ وہ آئی اے ایس، آئی پی ایس یا آئی ایف ایس، آئی آر ایس کی اعلیٰ ملازمتوں کی دنیا ہو یا قومی، بین الاقوامی سطح پر تجارتی میدان ہو۔ اہلِ امروہہ اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ہاں اعلیٰ تعلیمی میدان میں ابھی بیداری اس سطح کی نہیں ہے جس سطح کی ہونی چاہئے۔ یہاں کے حالات اس قسم کے اس لئے بھی ہیں کیونکہ تقسیم وطن کے سبب اس علاقے کی اعلیٰ ذہانتوں کی غالب اکثریت ہجرت کر گئی۔

معاشی اعتبار سے بھی طبقۂ اشرافیہ نے مہاجرت کو ترجیح دی۔ یہاں مڈل کلاس کے کچھ لوگ اور معاشی طور پر بدحالی کے شکار لوگ رہ گئے جو وقت کے ساتھ ساتھ معاشی استحکام حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ آج کی نسل کے سامنے ترجیحات دوسری ہیں۔ پہلے زندگی کی بنیادی سہولیات کے حصول کی تگ ودو ہے پھر فارغ البالی کی جانب قدم ہے۔ اس لئے ترقی کی رفتار دھیمی نظر آ رہی ہے۔'' امروھہ کے حالات کا جائزہ لیتے وقت عباسی صاحب انتہائی حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اُن کا تجزیہ اکثر معروضی ہوتا ہے۔

گھریلو زندگی

عباسی صاحب کی گھریلو زندگی نہایت ہی کامیاب ہے۔ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے باپ کے ناطے وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ ان کے بچے انتہائی فرمانبردار ہیں۔ اُن کے خوابوں اور، ان کے مشن کی تکمیل کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کاروباری مصروفیات اور دھن دولت کی فراوانی انسان کو ایک دوسرے سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ لیکن عباسی صاحب بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ان کا گھر ایک مکمل اکائی ہے جس میں موتیوں کی طرح سب ایک دوسرے کے ساتھ ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ ان کے فرزند فیروز عباسی انہیں کی طرح محنتی اور انہماک کے ساتھ کام کرنے والے انسان ہیں" دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے عباسی صاحب کی فطری وراثت اُن کے حصے میں آئی ہے۔

اتنا کافی نہیں ہے کہ وہ جنون کے ساتھ کام کرتے ہیں بلکہ ہر قدم پر احتیاط اور تجربے سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہر کام کو سلیقے اور منصوبہ بندی کے ساتھ پورا کرنے کے عادی ہیں۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ملکی و بین الاقوامی سطح پر سیاسی انتشار کے سبب ہندوستانی برآمدات کے سیکٹر کو کافی دھکا پہنچا ہے اور سینکڑوں ہزاروں ایسے لوگ ہیں جن کے قدم اُکھڑ چکے ہیں یا جنھوں

نے اپنی تجارت کا میدان بدل لیا ہے اور کسی طرح اپنے وجود کو بچانے کی جدو جہد کررہے ہیں۔ مگر عباسی صاحب بازار میں اپنے دم خم پر ٹکے ہوئے ہیں، با زار کا اثر ان کے بزنس پر بھی پڑا ہے لیکن ان کی مسلسل محنت اور بین الاقوامی وژن نے انہیں ثابت قدم رکھا ہے۔ وہ بازار میں ہر ممکنہ تبدیلی پر گہری اور باریک نظر رکھتے ہیں۔ بازار کے رجحانات کی بروقت شناخت میں اُنہیں ملکہ حاصل ہے۔ اس بزنس میں عباسی صاحب کے ساتھ ان کے لڑکے فیروز عباسی، بہو رینا عباسی، بیٹی شیبا میر اور رینو کا عباسی اور داماد عرفان میر ایک ٹیم کی طرح کام کررہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ تجارت میں کسی بھی اسٹیج پر غلطیوں کا امکان کم رہتا ہے۔ ان کے آپس میں تال میل اتنا اچھا ہے کہ رشک آتا ہے۔ ٹکنالوجی کے انقلاب نے مواصلات کے نظام کو آسان بنادیا ہے۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے لگاتار تبادلۂ خیال ہوتا رہتا ہے۔ بیٹیوں میں سے کوئی نہ کوئی حسبِ ضرورت یورپ اور امریکہ کے دورے پر ہوتی ہیں۔ بیٹے اور داماد میں سے بھی کسی نہ کسی کا بیرون ملک سفر کا پروگرام بنا ہی رہتا ہے۔ گھر میں درجنوں خدمت گاروں کی فوج ہونے کے باوجود بیگم عباسی اکثر اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانا پسند کرتی ہیں۔ گھر کے کھانے میں تقریباً سب کی پسند کا خیال رکھا

جاتا ہے۔ پھر بھی اگر کسی کی پسندیدہ شئے دسترخوان پر ندارد ہے تو وہ خاموشی سے دستیاب کھانے میں سے ہی اپنے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ عباسی صاحب کی بچیوں میں کسی قسم کے نخرے نہیں ہیں جیسے عام طور پر مال دار گھرانوں میں ہوتے ہیں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ جو ملا کھالیا اور خوش رہے۔

یہی حال گاڑیوں کا ہے۔ گھر اور دفتر میں درجنوں گاڑیاں ہونے کے باوجود کسی مخصوص کار کے لئے کوئی ضد نہیں کرتا۔ جو حاضر ہے وہی قبول ہے۔ بحث کا یا الجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گھریلو معاملوں میں کبھی ان لوگوں میں تناؤ نہیں دیکھا گیا۔ چھوٹی موٹی باتیں تو خیر ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ گھر میں کمان بیگم عباسی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اور وہ گھر کی اس خوبصورت دنیا کو مزید حُسن بخشنے میں کوشاں رہتی ہیں۔ اتنی ساری ذمہ داریوں کے باوجود نایاب صاحبہ کے چہرے پر ہمیشہ مُسکان کھلتی رہتی ہے۔ وہ نواسوں اور پوتوں میں مگن رہتی ہیں۔ انہیں فیکٹری، دفتر اور دیگر محاذوں پر ہونے والی ہر بات کا علم ہوتا ہے لیکن وہ بے ضرورت کہیں بھی ٹانگ اڑانا پسند نہیں کرتیں۔ وہ ایک خوش مزاج خاتون ہیں جو گھر اور گھر سے باہر کی دنیا میں بھی کافی مقبول ہیں۔ ان کی انکساری اور شبنم مزاجی کا ہی کرشمہ ہے کہ عباسی صاحب کی گھریلو زندگی

ایک مثالی زندگی ہے۔ وہ سب کی ضرورت کا خیال رکھتی ہیں۔ خود بھی خوش پوشاک اور خوش فکر خاتون ہیں۔ اُن سے ملنے والا ہر شخص اُن کی محبت واپنائیت کا قائل ہوجاتا ہے۔ عباسی صاحب اپنی بیگم صاحبہ کا ذکر انتہائی خلوص کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''میری زندگی اس بات کی مثال ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہر اچھے بُرے دنوں میں نایاب صاحبہ ایک حوصلہ کی چٹان بنی رہی ہیں۔ اُنہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ اگر بچوں کو سلیقے سے نہ سنبھالتیں تو میں بزنس پر اتنی یکسوئی کے ساتھ کیسے کام کر پاتا؟ یہ ان ہی کی دن رات کی محنتوں کا ثمرہ ہے کہ آج ہمارے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اعتماد کی دولت سے مالا مال ہیں۔ میرا یہ ماننا ہے کہ اگر عورت باشعور ہے تو مرد کارزارِ حیات میں اپنا کردار انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کرتا ہے۔ اور عروج حاصل کرتا ہے۔ میں اس معاملے میں نہایت ہی خوش نصیب انسان ہوں کہ مجھے نایاب صاحبہ جیسی رفیق حیات ملیں۔ میں دل سے اُن کا قدر دان ہوں'' نصف صدی ایک ساتھ گذرانے کے بعد عباسی صاحب کے اپنی بیگم صاحبہ کے بارے میں ظاہر کئے گئے جذبات ان کی عظمت کا ثبوت ہیں۔ وہ کتنے فراخ دل اور صاف گو انسان

ہیں۔

یہ ایک ازلی حقیقت ہے کہ زندگی میں رفاقت کی گاڑی دونوں پہیوں پر چلتی ہے اور اگر رفیق سفر سنجیدہ، متین اور باشعور ہے تو زندگی کا سفر آسان اور خوش کُن ہو جاتا ہے۔

عباسی صاحب کے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے لیکن اُن کے گھر کے کسی فرد میں گھمنڈ یا بناوٹ نام کو نہیں ہے۔ ہندستان میں اور مسلمانوں میں ایسے کتنے گھرانے ہیں دولت جنکے قدم چومتی ہو اور ان کے پاؤں زمین پر ہوں؟ عباسی صاحب کی فیملی ایک ایسی مثال قائم کرتی ہے جس سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ علم کی خو، بو تو کچھ ایسی ہے کہ جیسے اس گھر کا ہر شخص پڑھنے لکھنے کا شوقین ہو۔ بہترین کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ بھی ہے ان کے گھر میں بنیادی بات یہ ہے کہ یہ لوگ خوش رہنے کا ہُنر جانتے ہیں۔

قریبی مشاہدہ بتاتا ہے کہ ان کے گھر کا ہر فرد گھریلو اور دفتری کاموں میں ایک دوسرے کا معاون ہے اپنی اپنی ذمہ داریوں کے علاوہ ایک دوسرے کے کام میں تعاون کرنا ان کی فطرت ہے۔ آپس میں یہ اس طرح شیر و شکر ہیں کہ ان کے آپس میں کبھی کسی غلط فہمی کے پلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان کے ساتھ فیکٹری اور دفتر میں کام کرنے والا ہر شخص ہمیشہ خوش نظر آتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عباسی فیملی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ حتی لامکان دنیا میں خوشی بانٹیں اور اس محاذ پر بڑی حد تک انہیں کامیابی ملی ہے۔ ورنہ اس دور میں تو استحصال کرنے والوں کا دبدبہ ہے۔ عباسی صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کام کرنے والے بھی تو ہمارے اپنے ہیں اُن کے دکھ درد میں کام آنا بھی تو ہمارا ہی فرض ہے۔ شاید ان لوگوں کی ہی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ اُن کے کاروبار میں اللہ نے خوب برکت دی ہے۔ جب اوروں کی ناؤ ساحل پر ہی ڈوب رہی ہے تو وہ بھنور میں بھی بڑی کامیابی کے ساتھ آگے کا سفر طئے کر رہے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔

اسے عباسی فیملی کی انفرادیت قرار دی جانی چاہئے کہ اعلیٰ سوسائٹی کے رکھ رکھاؤ اور تہذیبی زندگی سے مکمل واقفیت اور لگاؤ کے باوجود یہ غریبوں، مجبوروں اور بے سہاروں کے دلوں میں بستے ہیں۔ سینکڑوں خاندانوں کو انہوں نے مفت تعلیم دلائی ہے۔ ان کی مدد کی ہے۔ اُن کی شادی بیاہ میں عملی طور پر تعاون کیا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ مدد کا جذبہ اُن میں مزید پروان چڑھتا جا رہا ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی ہو جس نے مدد طلب کی ہو اور عباسی فیملی سے اسے

مدد نہ ملی ہو۔ اس سلسلے میں بیگم عباسی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ تو یتیموں اور بیواؤں کی مدد کی لئے خود آ گے آتی ہیں۔ مختلف سماجی تنظیموں سے ان کی وابستگی ہے۔ مستحق لوگوں کے لئے اُن کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ عباسی صاحب کے گھر کا کوئی بھی فرد نام ونمود کی خاطر کچھ نہیں کرتا ہے۔ شہرت سے دور اپنی جد وجہد بھری پُر سکون زندگی میں مگن یہ لوگ اس دنیا کو ایک خوبصورت دنیا میں بدلنے کا خواب دیکھنے والے لوگ ہیں یہی اُن کی کامیاب گھریلو زندگی کی ضمانت بھی ہے۔

سادگی

بنیادی طور پر ''بھائی صاحب'' ایک سادگی پسند انسان ہیں۔ ظاہری کرّ وفر سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہیں۔ سادہ قمیص اور پینٹ پہننے والے محمد نفیس عباسی فطری طور پر ایک خوش لباس اور سادگی پسند انسان ہیں۔ وہ کسی شخص کی ظاہری شان وشوکت سے کبھی متاثر نہیں ہوتے اور نہ ظاہری شان وشوکت سے کسی دوسرے کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ انسانی قدروں کے جویا ہیں۔ فطرت کے قریب جو چیزیں انہیں نظر آتی ہیں، متاثر کرتی ہیں۔ باتوں میں بناوٹ اور تصنع آمیزی انہیں سخت ناپسند ہے۔ وہ گھُما پھرا کر بات کرنے کے سخت خلاف ہیں۔ سیدھی اور دوٹوک بات انہیں اچھی لگتی ہے۔ یہی اُن کا مزاج ہے۔ یہی اُن کی فطرت ہے۔ وہ گھن گرج والے انتہا پسند انسان نہیں ہیں۔ میانہ روی کے دلدادہ ہیں۔ لمحاتی اور عارضی باتوں کی جانب ان کی توجہ کم جاتی ہے۔ وہ قدروں کو سینے سے لگانے والے انسان ہیں۔ اعلیٰ وارفع انسانی قدریں اُن کی نظر میں اہم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی مقصد یا کسی عارضی نشانے کو ذہن میں رکھ کر تعلق پیدا نہیں کرتے۔ وہ بڑے مقاصد کے لئے کام کرتے ہیں اور اس لئے وسیع القلبی اور اعلیٰ ظرفی ان کی فطرت کا خاصہ ہیں۔

طرزِ گفتگو

عباسی صاحب ہر ایک شخص کی بات بڑے غور سے سنتے ہیں۔ بیچ میں ٹوکنے کی اُنہیں مطلق عادت نہیں ہے۔ مخاطب چاہے جس سطح کی بات کر رہا ہو، عباسی صاحب انتہائی توجہ اور صبر کے ساتھ اس کی بات سنتے ہیں۔ اور اس کا کوئی خاص سبب نہیں ہے۔ یہ ان کی عادت ہے، ان کی فطرت میں شامل ہے۔ مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ مختلف موضوعات پر اُن سے گفتگو کے مجھے مواقع ملے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اُنہیں خاموشی کے ساتھ پوری بات سنتے دیکھا ہے۔ مخاطب کی پوری بات توجہ سے سننے کے بعد اپنی بات عباسی صاحب چھوٹے اور مختصر جملوں میں شروع کرتے ہیں۔ پہلے ایک نکتہ پھر دوسرا اور تیسرا... سلسلہ چل پڑتا ہے انتہائی مدلّل ہوتی ہے اُن کی بات۔ کوئی بھی بات موضوع سے ہٹ کر کرنا انہیں پسند نہیں ہے۔ دوسری اور قابلِ ذکر بات ان کے طرزِ گفتگو میں یہ ہے کہ وہ جب تک کسی ایک موضوع پر بات مکمل نہیں کر لیتے، آگے نہیں بڑھتے۔ یہ بات عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ لوگ ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر اپنی گفتگو منتقل کرتے رہتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی بھی موضوع پر کوئی بھی بات مکمل نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گفتگو لا حاصل و محتاج تاثیر رہ جاتی ہے۔ ایسا معاملہ مسٹر عباسی کے ساتھ بالکل نہیں ہے۔ گفتگو کا سلیقہ

کوئی اُن سے سیکھے۔ چرب زبانی، یاوہ گوئی یا کوتاہ زبانی جیسی کوئی بات ان کے ہاں موجود نہیں ہوتی۔ سیدھی، سچی اور ہر قسم کے گھماؤ اور پیچ سے خالی ہوتی ہے ان کی بات چیت۔ پوچھنے پر وہ بتاتے ہیں کہ اگر ذہن بالکل آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہوتو گفتگو بھی پیچیدگی سے خالی ہوگی اور اگر ذہن میں کنفیوژن ہوتو بات چیت بھی گھماؤ دار ہوگی۔ اُن کا یہ فطری رویہ مواقع اور اشخاص کے ساتھ بغیر کسی تبدیلی کے قائم رہتا ہے۔ موسموں، حالات اور طبقات انفاس کا ان کے طریق کلام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

موجودہ عہد میں پل پل بدلتے چہروں، رویوں اور اصولوں کے درمیان اُن کی شخصیت ایک مینارۂ نور کی طرح بھیڑ میں بالکل الگ دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسی شخصیت جس پر اعتبار کیا جاسکے۔ اور یہ شئے اس دور میں عنقا ہے۔

جاننے والوں کی متفقہ رائے ہے کہ مسٹر عباس کے چہرے پر کوئی مکھوٹا نہیں ہوتا۔ وہ جیسے گھر میں دکھائی دیتے ہیں ویسے ہی اپنے دفتر میں نظر آتے ہیں۔ اپنے ملک میں ہوں چاہے غیر ممالک میں، ہمیشہ چہرے پر بشاشت ہوتی ہے وہ تجارتی معاملات ہوں یا گھریلو، کبھی تناؤ میں گھرے نظر نہیں آتے ہیں۔ بڑی سے بڑی مشکلوں کو وہ خندہ پیشانی سے جھیل لیتے ہیں۔

مشکلوں سے گھبرانا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ ہاں بے ڈھنگے پن سے اگر کسی مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی جائے تو اُنہیں غصہ آ جاتا ہے۔ ایسی فاش غلطی پر وہ انتہائی سلیقے سے سرزنش بھی کرتے ہیں۔ اس وقت بھی اگر کوئی انسان اپنی صفائی پیش کرنا چاہے تو اسے موقع دیتے ہیں۔ اس کی بات پوری توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔ پھر اُسے انتہائی مدلّل طریقے سے قائل کرتے ہیں۔ اور ایک بار اگر دل کا غبار نکل جائے تو چہرے پر پھر وہی پرانی بشاشت لوٹ آتی ہے۔ چند لمحوں بعد ان کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تناؤ نظر نہیں آتا۔ اُن کے دل میں پھانس کم ہی چبھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ غصہ کا اثر آوارہ بادلوں کی طرح ان کے چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور پھر گُم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ان کے ساتھ زندگی کا سفر طئے کرنے والوں کا ماننا ہے کہ وہ ایک غصہ ور انسان نہیں ہیں۔ نہایت ٹھنڈے دماغ کے ہیں۔ یہ نتیجہ لوگوں نے برسوں کے مشاہدے کے بعد اخذ کیا ہے جسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔

غصہ کے عالم میں بھی اگر انسان اپنی زبان پر قابو رکھے اور ٹھوس حقائق کی بنیاد پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے تو اس کے طرز کلام کو مثالی کہا جانا چاہئے اور یہ خصوصیت مسٹر عباسی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

حوصلہ مندی

تجارت میں فائدہ اور نقصان کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی تجارت نہیں ہے جس میں فائدے کی گارنٹی ہو اور نقصان کا دور دور تک کوئی امکان نہ ہو۔ تجارت کا معیار چاہے جو ہو، قسم چاہے جو ہو۔ کہا یہ جاتا ہے کہ تجارت میں منصوبہ بندی، لگاتار محنت اور ہوشیاری ضروری ہے۔ اگر کسی بھی موڑ پر چوک گئے تو پھر نقصان کا خدشہ بدستور قائم رہتا ہے۔ مسٹر عباسی کی زندگی میں ایک ایسا مرحلہ آیا کہ تجارت میں تمام باتوں کا خیال رکھنے کے باوجود انہیں زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی ایک کمپنی کے مال ہڑپ کر جانے سے مسٹر عباسی کو کروڑوں کا خسارہ ہوا۔ اور یہ گھاٹا اچانک ہوا۔ اچھی منصوبہ بندی، محنت، لگن اور اعلیٰ ذہانت کے باوجود عباسی صاحب شاطروں کے فریب کا شکار ہو گئے۔ حالت یہاں تک آ پہنچی کہ اُنہیں انکم ٹیکس کے اسّی لاکھ روپے ادا کرنے تھے اور جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اوپر سے دیگر قرض خواہوں نے جینا حرام کر دیا تھا۔ رات، دن کے تقاضوں سے پریشان مسٹر عباسی کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی تھی۔ نہ کچھ سکون کے ساتھ کھا پی سکتے تھے اور نہ نیند ہی آتی تھی۔ مسلسل ذہنی دباؤ نے مسٹر عباسی کے صحت پر انتہائی بُرا اثر ڈالا۔ ہر روز جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ حالت اُس آدمی کی تھی جس کے

اعصاب کی مضبوطی کے ہزاروں لوگ قائل تھے جو زندگی میں بلندی و پستی کے بے شمار تجربوں سے گذرا تھا۔ جس نے مشکلوں میں ہنسنے کا فن سکھایا تھا۔ آج وہی انسان ہنسنا بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہوں نے اپنا ذہنی توازن کھودیا ہو۔ تنہائی میں بڑبڑانا، عام سی بات ہوگئی تھی۔ اُنہیں کھانے پینے، سونے یا کسی دیگر باتوں سے دلچسپی تھی نہ اُن کے لئے کوئی معقول مشغلہ ہی تھا۔ اس واقعے کو مسٹر عباسی خود بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''جب لاکھوں روپے لوگوں کے دینے ہوں اور لاکھوں روپے انکم ٹیکس کے جمع کرنے ہوں۔ اور بار بار غور کرنے کے باوجود کوئی راستہ نظر نہ آرہا ہو تو انسان کیا کرے؟ میں بھی آخر ایک عام انسان تھا۔ میرے صبر کی بھی ایک حد تھی۔ میری ذہانت اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام ہورہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں حوصلہ کھورہا تھا۔ تسلی کے الفاظ مجھے دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ نظر آرہے تھے۔ اپنا مستقبل مجھے تاریک نظر آرہا تھا۔ کبھی کبھی رات کو آنکھ لگ جاتی تھی تو ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے تھے۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی ویران جزیرے میں قید ہوگیا ہوں میرے چاروں طرف لرزہ پیدا کردینے والی اونچی اونچی موجیں ہیں۔ اور دور دور تک کوئی کنارا نہیں ہے۔ بھیانک پانیوں کا شور دل میں شدید ناکامی

کے جذبے کو ہوا دیتا تھا۔ لفظ ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ ایک بے بس سی خاموشی وجود کے اطراف دھیرے دھیرے پاؤں پسار رہی تھی۔

تمام معاملات پر ازسرِنو غور کرنے اور حالات کا تجزیہ کرنے کا سلسلہ بھی آخر کار دم توڑ گیا کیونکہ ہر بار مسئلہ کو نئے ڈھنگ سے دیکھنے کے باوجود اس محبس میں امکانات کی کوئی کھڑکی کھلی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، وہی رُسوائی کا خوف۔ بیوی، بچوں کے ساتھ دنیا کے ممکنہ رویے کے بارے میں سوچ کر ہی جسم پر جیسے لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ساری ساری رات آسمان کو گھورنے کے باوجود امید کا کوئی تارا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نہ کوئی ایسی شخصیت نگاہ میں جمتی تھی جو مسئلہ کو حل کر سکے اور نہ ہی کوئی بینک یا تنظیم۔ ایسے میں کیا کرتا۔ بینک سے اور ڈرافٹ (Over draft) کی سہولت کا دروازہ بھی بند تھا۔ انکم ٹیکس کے شعبے سے آئی ایک چٹھی نے ہی بینک سے مدد کے سارے راستے مسدود کر دیئے تھے۔ جب تک انکم ٹیکس کے شعبے سے ہری جھنڈی نہیں ملتی، بینک کے اہل کار میری بات بھی سننے کو راضی نہیں تھے۔ میں نے اپنی دانست میں خوب کوشش کر کے دیکھ لی تھی لیکن بینک کے افسروں کی ایک ہی رٹ تھی کہ محکمۂ انکم ٹیکس ہمیں اجازت نامہ عطا کرے تو ہم

آپ کی مدد کے لئے سوچ سکتے ہیں ورنہ اور کوئی راستہ نہیں ہے اور محکمۂ انکم ٹیکس کے مطابق میری کمپنی کی جانب اسی لاکھ روپے کی رقم بقایا تھی۔ اب موٹے طور پر یہ بات واضح تھی کہ نہ اسی لاکھ روپے ہوں گے اور نہ ہی مجھے بینک سے کوئی سہارا مل پائے گا۔ اس بات کا کچھ کچھ اندازہ اُن لوگوں کو ہو چکا تھا جنکا میں مقروض تھا یہی سبب ہے کہ اُن کے تقاضے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے جا رہے تھے۔

تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ نتیجتاً میں نے اپنی شکست مان لی اور ایک بھیانک فیصلہ کیا... یہ فیصلہ تھا خودکشی کا! حالات اتنے سنگ دل ہو گئے ایسا کبھی تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ میں ڈوب رہا تھا اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی نہیں تھا۔ میں مزید رسوائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بس اسی قسم کے ایک کمزور لمحے میں، میں نے ایک خاموش فیصلہ کیا اور اس پر عمل درآمد کے بعد کے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور خودکشی کا بیان (Sucide note) تیار کیا جس میں اپنے حالات لکھے اور مقروض ہونے کی بات مانی اور کوئی راستہ نہ پا کر خودکشی کرنے کی بات کا ذکر کیا۔ اس بیان میں اپنی بچوں اور کسی بھی دیگر فرد یا افراد کو اپنی موت کی ذمہ داری سے بری الذمہ

قرار دیا۔ اپنی موت کی ذمہ داری خود اپنے سر لی! بہت سوچ بچار کر گھر سے نکلا،
بیوی بچوں پر الوداعی نظر ڈالی اور چل پڑا۔ سارے ارمانوں کے دیئے بجھ گئے
تھے۔ اپنی بیوی، بچوں کے لئے جو اور جیسا میں کرنا چاہتا تھا نہیں کر پایا تھا۔ یہی
احساسِ شکستگی دل پر بچھو کے ڈنک لگا رہا تھا۔ لیکن میں انجان دشت کے سفر کا قصد کر
چکا تھا۔ درد سے سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اور میں آگے بڑھ
گیا اپنی زندگی کو ختم کرنے۔ قطب مینار سے چھلانگ لگا کر سانس کی اس متبرک
مشعل کو ہمیشہ کے لئے بجھا ڈالنے کو چلا تھا میں۔

قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ کولتار کی ننگی سڑک تھی۔ شور تھا۔ بھیڑ تھی۔
طویل عمارتوں کا ایک سلسلہ تھا۔ کنکریٹ کے جنگل سے گذرتے ہوئے آخری
بار اس دنیا کو، اسکی رنگینی کو انتہائی بے بسی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ دل میں اب بھی
جینے اور زیست کرنے کی دبی دبی خواہش موجود تھی۔ مگر فیصلہ بھی تو کوئی چیز ہوتی
ہے۔ جب سارے راستے بند ہو جائیں تو دیواروں سے سر ٹکرا کر خود کو قسطوں
میں لہولہان کرنے سے بہتر ہے کہ جسم و جان کی اس بندگلی سے لوٹ آیا جائے!
اور یہی کر رہا تھا میں۔ مرزا غالبؔ کے اس شعر کو ایک الگ ہی نقطۂ نظر سے دیکھ
رہا تھا میں۔

جان دے دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

حقیقی دنیا تو بڑی ہی ظالم وسنگ دل ثابت ہوئی تھی اس لئے تصور کی ایک دنیا سجا لی تھی میں نے تصور میں اپنی موت کے بعد کا منظر دیکھا تھا۔ کہرام کرنیو والے عزیز و اقارب تھے۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں تھیں۔ اخبار میں چھپی ہوئی چھوٹی سی خبر تھی۔ خبر کے لہجہ میں افسوس تھا۔ ہمدردی تھی۔ واہ رے دنیا! مرنے کے بعد ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے۔ کاش جیتے جی یہی ہمدردی کا رویہ اپناتی تو اس جہانِ رنگ و بو میں کچھ مہینے، کچھ سال، میرے نام اور بھی ہوتے! خیالات کا ایک نہ ختم ہونے والا ریلا تھا جو بسنت کی مدھ بھری ہوا کی طرح وڑاتا ہوا آجاتا تھا۔ آخر یہ کتنی عجیب گھڑی تھی لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور میں موت کو گلے لگانے جا رہا تھا۔ موت میرا انتخاب نہیں تھی۔ مجبوری تھی ایسی مجبوری جسے اوڑھنے کی پابندی تھی۔ ہر سانس کے ساتھ ایک نیا خیال ایک نئے رنگ میں نگاہِ شعور کے سامنے آن موجود ہوتا۔

مذہب، خدا، موت، عالمِ برزخ، روزِ محشر، جنت و دوزخ اور اچھے بُرے اعمال کا احتساب کا خیال ایک ایک کر کے ذہن میں آتا گیا۔

بچپن سے ہی مذہبی تعلیم خون میں رچی بسی تھی۔ مذہب کے بارے

میں بنیادی معلومات بھی تھی۔ گو مذہب کی زیادہ پابندی بھی نہیں تھی لیکن مذہب سے برگشتہ بھی نہیں تھا میں۔ مذہب کی برکات پر بھروسہ بھی تھا۔ مذہب میرے نزدیک ایک حسین وراثت کی طرح تھا۔ یہ اس دروازے کی طرح تھا جس سے گذر کر میں نے زندگی کی طویل راہوں کا مطلب سمجھا جس کی معنویت کے اسرار ہمیشہ خوابناک انداز میں مجھ پر کھلے۔ مذہب نے میری حفاظت بھی کی تھی۔ تسلی بھی دی تھی، راستہ بھی دکھایا تھا۔ منزل کی نشاندہی بھی کی تھی۔ مذہب نے مجھے ایک اچھا انسان بننے کی دعوت بھی تھی اور رغبت بھی دلائی تھی۔ جب میں اپنے اندر موجود تھوڑی بہت صفات پر غور کرتا ہوں تو مجھے مذہب کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذہب، اندھیرے میں ایک روشنی کی طرح تھا۔ سب کچھ تھا۔ مگر میں کیا کرتا۔ آج اس کے خلاف اپنی زندگی دینے پر بضد ہو گیا تھا کیونکہ مجھ میں مزید دباؤ اور تناؤ سہنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی۔

خدا کی ذات پر یقین ایک تحفہ تھا جسے میں نے مشکل سے مشکل حالات میں سینچ، سمیٹ کر اپنے سینے میں محفوظ رکھا تھا۔ خدا، جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ جو سب کچھ جانتا ہے۔ جو سب کچھ دیکھتا ہے۔ پکارنے والوں کی پکار سنتا ہے۔ جو

بڑا عدل والا ہے۔ کرم والا ہے، رحم والا ہے، ستر ماؤں کی محبت کرنے والا ہے جو پتھروں کے درمیان، سمندروں کی تاریک گہرائی میں، اور آسمانوں کی نا معلوم بلندیوں میں رہنے بسنے والے جانداروں اور بے جانوں کی حقیقت جانتا ہے اور ان کے درمیان توازن بنائے رکھتا ہے۔ اس پر میرا سمندروں سے بھی زیادہ گہرا، آسمانوں سے بھی زیادہ وسیع یقین تھا۔ میں اسے پکار رہا تھا؟ یا شاید اُسے یاد کر رہا تھا؟ یا شاید اُس سے اپنی فریاد کر رہا تھا؟ یا شاید موت کی تاویل پیش کر رہا تھا؟ معلوم نہیں کن لفظوں، کن رنگوں اور کن لہروں میں اس کے وجود کو محسوس کر رہا تھا میں۔ افسوس بھی تھا، غم بھی تھا... مگر حیرانی بھی تھی کہ وہ میرے جائز مطالبات پورے کیوں نہیں کر رہا ہے؟ وہ میری سُن کیوں نہیں رہا ہے......؟ میں آگے کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا۔ بس دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اب جو سوچتا ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ میں اس وقت کنفیوز تھا؟ شاید میری سوچ کا دائرہ محدود تھا!

موت:

موت کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا میں نے۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ خُود کشی حرام ہے۔ موت، میری دوست نہیں تھی۔ دوست تو زندگی تھی لیکن دنیا کی

ستم ظریفی نے اپنی دوست سے منہہ موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بس رہا تھا میں
درد و مایوسی کے پاٹوں کے بیچ اور دنیا تماشہ دیکھ رہی تھی! ڈر بھی لگ رہا تھا کہ
جب موت آئے گی تو جسم کو کتنی اذیت ہوگی؟ بزرگوں کے اقوال اور کتابوں
میں موت کے ذکر کی تفصیل ذہن میں لپکے کی مانند کوند آئی۔ ایک لحظہ کو تو بدن
کانپ کر رہ کر گیا، مگر ہارے مجبوری......!

عالمِ برزخ:

عالمِ برزخ کے بارے میں بھی عالموں کی زبانی سنا تھا کہ عجیب عالم ہوتا ہے۔
روح اگر نیک ہے تو عالمِ برزخ میں جنت کی راحتیں نصیب ہوتی ہیں اور اگر
روح گناہ گار ہے تو سزا بھگتتی ہے۔ نہایت ڈراؤنی تصویر تھی میرے ذہن میں
عالم برزخ کی۔ خیال آیا کہ اگر موت حرام ہوئی تو عالمِ برزخ سے ہی عذاب کا
سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ حشر کے روز جو ہوگا سو ہوگا۔ یہ سب کسی کہانی کا حصہ
نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ انسان کی ذہنی کیفیت کے احوال ہیں۔ میں کیا کرتا؟
میرے پاس انتخاب کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ مرنا میرا مقدر تھا۔ قرض
خواہوں اور محکمہ انکم ٹیکس کی فولادی جکڑ بندی سے بچنے کی بہت مشکل لیکن
صرف ایک ترکیب یہی تھی یعنی خودکشی!

یہ بات اُسّی کی دہائی کی ہے لیکن ۲۱ ویں صدی میں پہنچ کر بھی قانون میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ آئے دن تجارت میں ناکام ہوکر خودکشی کرنے والوں کی خبریں اخبار و ٹیلی ویژن کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ لیکن سماج کے مصلحین اور سیاسی مفکرین کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اُن زندہ لوگوں کو موت کی اندھی کھائی میں گرنے سے بچانے کی ہمارے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔ بات کہاں کی تھی اور کہاں چلی آئی۔ بہر کیف عالمِ برزخ کے عذاب کے بارے میں سوچ سوچ کر پسینے آرہے تھے ... لیکن قدم بڑھتے ہی جارہے تھے۔

روزِ محشر:

محشر کے روز جب کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہوگا۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ جسم کے اعضا تک گواہی کے لئے مخالف کیمپ میں شامل ہوجائیں گے۔ ایسے میں خودکشی کا معاملہ میری تمام نیکیوں پر غالب آجائے گا۔ تب کیا ہوگا؟ کیا یہ دلیل کام آئیگی کہ دنیا کی رسوائی کے خوف سے میں نے حرام موت کو گلے لگا لیا؟ دل یہ کہتا تھا۔ یہ دلیل بودی ہے۔ یہ نہیں چلے گی۔ سیدھے سیدھے آگ کے حوالے کردیا جاؤں گا۔ اب جو ہوگا، دیکھا جائیگا۔ فی الحال اس رُسوائی سے

بچنے کا کوئی اور طریقہ مجھے دکھائی نہیں پڑ رہا ہے۔

جنت ودوزخ:

جنت ودوزخ کا خیال مرنے والوں کو کچھ زیادہ ہی آتا ہے۔ وہ شخص جس نے زندگی کی امیدیں چھوڑ دی ہوں۔ جس کے پاس موت کو گلے لگانے کا پکا یقین ہو چلا ہو، اسے مرنے کے بعد کے مرحلوں کے بارے میں سوچنے کے بہت سے جواز ہوتے ہیں۔ میں بھی اُن ہی خیالوں میں گُم تھا۔ زندگی کی بھاگ دوڑ میں موت کے بعد کی زندگی کا خیال کم ہی آتا ہے۔ کبھی کسی کتاب کے مطالعہ کے وقت یا پھر اگر کوئی ذکر چھڑ جائے تو انسان موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ ورنہ دنیاوی معاملات کچھ اس طرح حاوی رہتے ہیں کہ دیگر باتیں ضمنی ہو جاتی ہیں۔ اب وہ ساری باتیں یاد آرہی تھیں۔ اپنی بھول، چوک، کوتاہیاں... سب یاد آرہی تھیں۔ ایک طرح سے ساری زندگی کا لیکھا جوکھا نظروں کے سامنے تھا۔ جنت، دوزخ سے جُڑی جن باتوں کو ہم ہنسی ہنسی میں ٹال جایا کرتے تھے۔ اب وہ سوالیہ نشان بن کر سامنے تھیں کہ اگر اسی بھیانک طریقے سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو کیا ہوگا۔ دل پر پتھر رکھ کر میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ذہنی طور پر میں بڑی حد تک مفلوج ہو چکا تھا۔

سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ بار بار یہ فکر بھی ستاتی تھی کہ میرے بعد میرے گھر کے دیگر افراد کا کیا ہوگا؟ کیسے جئیں گے وہ؛ کیسے سر اُٹھا کے چل پائیں گے دنیا کے سامنے؟ میرے ان حالات کی درد بھری داستان سننے اور پڑھنے والے مجھے زود اشتعال سمجھنے کی غلطی کر بیٹھیں گے۔ کیونکہ میرا معاملہ ان عام تاجروں جیسا نہیں تھا جنہیں تجارت اور اس سے وابستہ امارت، وراثت میں ملتی ہے۔ میں نے تو اپنی زندگی کی شروعات ایک ایک پیسہ جوڑ کر کی تھی۔ ایک معمولی انسان سے کروڑوں میں کھیلنے والا بزنس مین بن گیا تھا۔ اور اب حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ یہ کروڑ پتی، خاک پتی بن گیا تھا۔ تنکا تنکا جوڑ کر بنایا گیا آشیانہ اب میری آنکھوں کے سامنے ہی انتشار پذیر تھا۔ خوابوں کے محل چکنا چور ہو رہے تھے اور میں بے بسی سے تماشائی بنا دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی بربادی کا احساس اس لئے شاید شدید ترین تھا۔

اپنی دُھن میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک بیڑی کی طلب ہوئی تو میں نے دوکان تلاش کرنی شروع کی۔ پاس ہی فٹ پاتھ پر دوکان دکھائی دی۔ میں وہاں پہنچ کر بیڑی سلگانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک ایسے شخص کو دیکھا جسکی صرف ایک ٹانگ تھی۔ وہ سائیکل لئے ہوئے تھا۔ میں اس معذور انسان کو دیکھ

کر ذرا حیران ہوا پھر اس کی یہ بات مجھے مزید حیران کر گئی'' مجھے جلدی جانا ہے
بھیا، میری ڈیوٹی کا وقت ہو رہا ہے'' میں نے حیرت سے اسکی بات سُنی اور اس
کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک جستجو نے جنم لیا۔ اور اسی جستجو کے تحت میں
نے اس ادھورے شخص کی پوری کہانی جاننے کی کوشش شروع کر دی۔ میری
سوالوں کے جواب میں اس نے مختصراً بتایا کہ وہ روزانہ تقریباً دو گھنٹے کا سفر
سائیکل سے طئے کر کے صدر بازار پہنچتا ہے۔ وہاں وہ ایک لالا جی کی دوکان پر
چوکیداری کرتا ہے۔ اور دوکان پر آنے والوں سے چونکہ اُس کی شناسائی ہے
اس لئے کئی لوگ اپنے سامان کی گٹھری بھی کبھی کچھ گھنٹوں کے لئے چھوڑ جاتے
ہیں اور اس کی رکھوالی کے عوض کچھ پیسے دے دیتے ہیں۔ اس طرح وہ لگ بھگ
ڈیڑھ روپے روزانہ کما لیتا ہے۔ اس کی واپسی رات گئے ہوتی ہے۔ وہ یہ ساری
جدوجہد اس لئے کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے بچوں کو اونچی تعلیم دلانا چاہتا ہے۔ میں
اسکی اس جدوجہد کی داستان سے بہت متاثر ہوا۔

زمین سے جڑے اس محنت کش شخص کی ہمّت اور حوصلے نے مجھے
سوچنے کا ایک نیا انداز دیا۔ میں نے اپنی خودکشی کے فیصلے کو وقتی طور پر ملتوی کر
دیا اور نئے حساب سے غور و فکر کرنے لگا۔ اب مجھے ایک نئی توانائی کا احساس

ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیت کو پہچان لیا ہو۔ بس یہیں سے شروع ہوا زندگی کا ایک نیا باب، جس میں وقت نے اپنے انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں۔ میں قطب مینار تک جانے کے بجائے گھر لوٹ آیا اور حالات کا از سرِ نو جائزہ لینا شروع کیا۔ تین چار دنوں کی یکسوئی کے ساتھ کی گئی منصوبہ بندی پر اب عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اپنے دفتر اور مکان کی اہم اشیاء اکٹھی کرلیں اور اُنہیں فروخت کر دیا۔ اس سے جو آمدنی ہوئی اُسے میں مختلف حصّوں میں بانٹ کر اپنے قرض خواہوں سے ایک ایک کر کے ملنے لگا اور اُن سے مل کر یہ صاف کیا کہ میں انہیں کچھ ہزار روپے بطور قسط کے ادا کرونگا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ میرے دوٹوک لفظوں میں کہی ہوئی بات کا اثر ہوا اور لوگ میری بات ماننے لگے۔ اسی طرح پچاس ہزار روپے لے کر میں انکم ٹیکس کمشنر کے دفتر پہنچا۔ کسی طرح میں کمشنر صاحب کے کمرے میں داخل ہو گیا ان کے دفتر پر تعینات اردلی نے عقب سے میرا گریبان پکڑ لیا۔ میں نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''مجھے چھوڑ دو میں کمشنر صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میری تمام چیخ و پکار کو درکنار کر اس شخص نے میرے ساتھ پکڑ دھکڑ جاری رکھی۔ میں نے جب بلند آواز میں کمشنر صاحب کو بتایا کہ میں چھیاسی لاکھ

روپے کا ٹیکس کا دیندار ہوں تو اُن کے لہجہ میں ایک تبدیلی آئی اور انہوں نے پوری انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی مشکل بیان کروں۔ اس طرح پہلی بار مسٹر عباسی کو اپنی بات کہنے کا موقع ملا جس میں انہوں نے کہا کہ وہ اقتصادی طور پر ٹوٹ چکے ہیں۔ اُن کے پاس قرض خواہوں کو دینے کے لئے روپے نہیں ہیں اور وہ صرف پچاس ہزار روپے انکم ٹیکس ڈیپارٹ منٹ کو ایک وقت میں دے سکتے ہیں اور پچاس ہزار روپے فی ماہ کے حساب سے قسطیں جمع کر سکتے ہیں اس سے زیادہ کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عباسی صاحب کے اس جرات مندانہ اقدام کا مثبت نتیجہ نکلا۔ اور کمشنر صاحب اُن کی اس درخواست کو مان گئے اور ساتھ ہی بینک کو ایک خط بھی لکھ دیا۔ خط پا کر بینک کے افسران نے انجماد (freezing) کے فیصلے کو واپس لے لیا اور پھر ضرورت کے مطابق بینک نے امدادی قدم بھی اُٹھائے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مسٹر عباسی کو یہ محسوس ہوا کہ جیسے بازی ایک بار پھر اُن کے حق میں پلٹ گئی ہر چند کہ فضا ناسازگار تھی۔ زمانہ کی ہوا دشمن معلوم ہو رہی تھی لیکن حوصلہ کے ساتھ کئے گئے فیصلوں نے وقت کے دھارے کا رُخ موڑ کر رکھ دیا۔

اب قرض خواہوں کے تقاضے نہیں تھے۔ بینک کے دروازے اُن

کے لئے بند نہیں تھے۔ محکمۂ انکم ٹیکس کا رویہ جابرانہ نہیں تھا۔ وہی دنیا جس میں جینا دوبھر تھا اب جینے لائق ہو گئی تھی۔ بعد کے زمانے میں پھر ایسی کامیابی حاصل ہوئی جو اپنے آپ میں ایک تاریخ ہے۔ اچھے موسموں کی آمد کے پیچھے وہ فیصلے بھی تھے جو مسٹر عباسی نے کئے جس کے تحت کئی سالوں تک انہوں نے کار میں سفر نہیں کیا۔ عیش و آرام کو کم کر کے بس دن رات محنت شاقہ کو اپنا شعار بنا لیا۔

مسٹر عباسی کی زندگی کا یہ کمزور لمحہ پل جھپکتے نہیں گذر گیا۔ سب کچھ وہی تھا۔ لوگ وہی تھے بینک، محکمۂ انکم ٹیکس، قرض خواہوں کا ریلا... سب کچھ وہی تھا۔ اسی سے تو پناہ لینا چاہتے تھے۔ مسٹر عباسی موت کے منہ میں جا کر لوٹے تھے اور اب بدل گیا تھا اُن کا اندازِ نظر۔ اسی نئے اندازِ نظر نے انہیں نئی راہیں دکھائیں۔ جن پہ چل کر وہ حالات کی سنگین شکنجوں سے نکل سکے۔ ایک بار پھر مانند آفتاب چمکنے کے لئے!

یادوں کی اس سُرنگ میں واپس جاتے ہوئے مسٹر عباسی بتاتے ہیں کہ وہ گھر لوٹے اور اپنی رفیقۂ حیات نایاب عباسی سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں آنے والے پانچ دنوں تک کے لئے بند ہو کر خاموشی سے مستقبل کی منصوبہ

بندی کرنا چاہتے ہیں اس لئے کوئی بھی انہیں ڈسٹرب نہ کرے۔ ایسا ہی ہوا۔ ان پانچ دنوں میں مسٹر عباسی نے زبردست منصوبہ بندی کی اور حالات کا سچائی اور پامردی سے مقابلے کا فیصلہ کیا اور ایک مربوط لائحۂ عمل تیار کیا۔ اور اس لائحۂ عمل پر چھٹے دن سے انہوں نے عمل درآمد بھی شروع کر دیا۔

تناؤ اور دباؤ بھرے ان حالات میں شاید چند ہی لوگ ہونگے جو دوٹوک، شفاف اور دروں بنی پر مشتمل فیصلہ کر سکتے ہوں۔ عالم کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ فیصلے تو اہم ہوتے ہی ہیں لیکن زندگی میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا ذکر اہم نہیں ہوتا، ہاں اگر وہ یادوں کے نہاں خانوں میں محفوظ رہ جائیں تو پھر اُن کی قدر و قیمت میں چنداں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان یادوں کو سمجھنے، سمیٹنے کی خواہش، ممکن ہے لاتعداد لوگوں کے دلوں میں ہو لیکن اسے سمیٹنے کا سلیقہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کو تعداد تو اور بھی کم ہوتی ہے جو ان چھوٹی چھوٹی، لیکن بے بہا یادوں کے خزانوں سے نئی سمت، نئی اسپرٹ حاصل کرتے ہیں۔ ہر دور میں مشاہیرِ زمانہ شخصیتوں کی زندگی میں بڑے حالات، بڑے معاملات اور بڑے واقعے انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن عام لوگوں کے لئے وہ بڑے معاملات اتنے جاذبِ نظر نہیں ہوتے جتنے

چھوٹے چھوٹے واقعات ۔ چونکہ وہ چھوٹی باتوں پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتے ہیں ۔
علماء کا قول ہے کہ جو لوگ چھوٹی باتوں پر دھیان نہیں دیتے ہیں اُن سے بڑی
باتوں پر توجہ دینے کی اُمید نہیں کرنی چاہئے ۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں
یوں کہا گیا ہے، کہ جو لوگ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر قابو نہیں پا سکتے وہ اپنی بڑی
کوتاہیوں پر بھی قابو نہیں پا سکتے ۔ یہی سبب ہے کہ اہلِ مشرق اپنے خوردوں کی
تربیت کا خاص خیال رکھتے آئے ہیں ۔ اور اُنہیں مخصوص عادات واطوار کی
ٹریننگ دی جاتی ہے اس تربیت میں زندگی کے بڑے اور اہم معرکے سر کونے
کے گُر تو سکھائے جاتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں پر خصوصی توجہ دی جاتی
ہے ۔ مسٹر عباسی کی زندگی میں بھی اسی قسم کے بہ ظاہر معمولی نظر آنے والے لیکن
اہم واقعات پیش آئے ہیں ۔ اگر زندگی میں ہر پل کچھ نہ کچھ نیا وقوع پذیر نہ ہو تو
زندگی بوجھل ہو کر معنویت کو ترسنے لگتی ہے ۔

دراصل واقعہ اہم نہیں ہوتا ۔ اہم ہوتا ہے اس واقعہ کے ردِّ عمل یا زیر
اثر اپنایا گیا انسانی رویّہ ۔ ہر واقعہ کا ایک ٹریٹ منٹ ہوتا ہے یہاں انسان اہم
ہو جاتا ہے ۔ یہ اُسی پر منحصر ہے کہ وہ اس واقعہ کو اپنی زندگی میں کس طرح قبول
کرتا ہے ۔ ردّ و قبول کا یہ عمل کوئی اضطراری فعل نہیں ہوتا ۔ یہ ایک مکمل انداز نظر کا

نتیجہ ہوتا ہے۔ نظر، نظر کے درمیان امتیاز کرنا اور پھر اُس میں ایک خصوصی انداز پیدا کرنا در پردہ اپنی شخصیت کی تکمیل کرنا ہے۔ عباسی صاحب نے اپنی زندگی میں انداز نظر پیدا کیا اور پھر اس کی معجز نمائی سے مستفیض بھی ہوئے۔ زندگی کا کالے کوسوں سفر طئے کرتے ہوئے انہوں نے گندم اور جو کے مزاج کو بھی سمجھا اور اُن کے درمیان امتیازات کو بھی۔ بہ قولِ شاعر۔

شہرِ انا میں نام کمانا کب اتنا آسان ہوا
اُس نے کڑی محنت سے بھائی پتھر کو پگھلا یا ہے۔

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں ہو سکتا

دنیا کے تمام بڑے لوگ جنہوں نے اس عالمِ صد رنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان میں عام انسانوں کے مقابلے بعض خصوصیات کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے وقت کی ریت پر اپنے وجود کے نقش قائم کئے ان کی زندگیوں پر جب ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ کہ ان کے اندر آرزوؤں کی جیسے ایک کہکشاں موجود تھی۔ اور اُس کہکشاں کے جلوؤ میں ایسی اضطراب انگیز موجیں موجزن تھیں جنہیں پارکھی نگاہیں آسانی سے تاڑ لیتی ہیں۔ یہ اُن اضطراب انگیز موجوں کی ہی کرشمہ سازی ہے کہ انسان ہر شکست کو فتح میں تبدیل کرنے پر مُصر رہتا ہے اور جدوجہد کے میدان میں مسلسل سرگرم ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے یہاں ہر شکست ایک فتح کا اعلان ہوتی ہے اور ساتھ ہی ایک سبق آموز واقعہ بھی۔

انسانی تاریخ میں ذہنی رویّوں کے معروضی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ دنیا میں جنہوں نے ''بڑے کام'' انجام دیئے ہیں وہ وقتی کامیابی کو اپنی منزل ماننے کی غلطی نہیں کرتے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو بڑی فتوحات کے لئے زینہ تصور کرتے ہیں لہٰذا ہر کامیابی اُنہیں مزید حوصلہ اور قوت بخشتی ہے۔ اور عزائم کو مزید مستحکم کرتی ہے۔ اس کے برعکس کوتاہ عزم لوگ

معمولی کامیابیوں کو اپنی زندگی کا نصب العین مان لیتے ہیں نتیجتاً اُن کا سفر بھی نتیجہ خیزی کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتنا نہیں گردانا جاتا۔

عباسی صاحب کا تعلق اس قافلے سے ہے جن کے دم پر زمانے کو فخر ہوتا ہے، نسلیں جنہیں یاد کرتی ہیں، جو صفحۂ تاریخ پر اپنے وجود کی مہر ثبت کرتے ہیں۔

دورانِ گفتگو وہ فرماتے ہیں کہ جدوجہد زندگانی میں بنیادی عنصر ''حوصلہ'' ہے۔ ہار نہ ماننے کی ضد ہے۔ آگے بڑھتے رہنے کا ایک نہ مسمار نہ ہونے والا جذبہ ہے۔ جس نے ٹھان لی ہو کامیابی کے حصول کی، اسے کون روک سکتا ہے۔ کامیاب ہونے والے انسان کو پہاڑی ندی کی مثال نظر میں رکھنی چاہئے جو بڑے بڑے پتھروں کو پاش پاش کر دیتی ہے اور اپنا رستہ بناتی ہے۔ ہاں اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ پہاڑی دریا راہ میں در آنے والی چٹانوں سے سر ٹکرانے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا بلکہ چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے ہر اس موقع کی تلاش میں رہتا ہے جس سے اسے پھیلنے اور آگے بڑھنے کی راہیں ہموار ہوں۔ تصادمات زندگی کا حصہ ہیں۔ زندگی کا مقصد نہیں۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ ان تصادمات کا حوصلہ مندی سے سامنا کرتے ہوئے صلح

جوئی کا رویہ بھی اپنائے۔ عملی زندگی میں صلح جوئی ایک ہتھیار ہے۔ ایک لائحۂ عمل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عوام کی اکثریت صلح جوئی کو ہتھیار بنانے اور اسے لائحۂ عمل کے طور پر برتنے کے فن سے ناواقف ہے۔ جس کا خمیازہ اسے قدم قدم پر بھگتنا پڑتا ہے۔

تعلیمی مُہم

موجودہ دور میں ہندوستانی معاشرے میں تعلیمی بیداری کے مورچے
پر محنت کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ خصوصاً مسلم معاشرہ تعلیمی محاذ پر اپنی کاوشو
ں کو درج نہیں کرا پا رہا ہے۔ اقتصادی استحکام، تعلیمی بنیادوں پر ہی آ سکتا ہے۔
یہ بات عباسی صاحب کے ذہن میں بالکل واضح ہے۔ اس لئے وہ حتی لامکان
یہ کوشش کرتے ہیں کہ تعلیمی محاذ پر انتہائی منصوبہ بندی اور انہماک کے ساتھ کام
کیا جانا چاہئے۔ اپنی اس فکر کے تحت وہ اپنے کالج کے علاوہ سینکڑوں تعلیمی
اداروں سے وابستہ ہیں اور فرماتے ہیں ''تعلیمی میدان بالکل سونا پڑا ہوا ہے۔
دیہی علاقوں میں تو حالات، بالکل ابتر ہیں۔ آج ضرورت بنیادی تعلیم کی تو ہے
ہی لیکن پیشہ ورانہ تعلیم ناگزیر ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے بغیر روایتی طریقوں سے
اشیاء سازی کی بازار میں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ روز بروز نئی ٹکنالوجی سامنے آ رہی
ہے۔ یہ دور خودکار مشینوں کا ہے۔ سارے کام کمپیوٹر نیٹ ورکنگ کے ذریعے
انجام دیئے جا رہے ہیں۔ بین الاقوامی منڈی میں تو یہ فارمولہ عام ہے کہ انسانی
ورک فورس میں کمی لاؤ اور اشیاء کی قیمت گھٹاؤ۔ انسانی ہاتھ کے متبادل کے طور
پر مشینوں کو جگہ دو۔ یہ ایک بڑی سچائی ہے لیکن اس سے بھی بڑی سچائی یہ ہے کہ
ہم جیسے ترقی پذیر ممالک جس قسم کے گلوبلائزیشن کے شکار ہیں اس میں پر

وڈکشن کے اس طریقۂ کار سے مفر نہیں ہے۔ آپ کی شراکت اس سسٹم میں لازمی ہے۔ اگر آپ کو اس بازار میں اپنے وجود کو محفوظ رکھنا ہے تو اس کے قوانین واصولوں کو بھی اپنانا ہوگا۔

اس نئے بازار کا اصول یہ ہے کہ یہاں ہر شئے بکاؤ ہے۔ اس کے لئے آپ کو بیچنے کا فن آنا چاہئے۔ اگر معمولی چکنی مٹی جس سے ہمارے گھروں کی عورتیں چولہے اور آنگن کی لپائی پوتائی کا کام لیتی ہیں کو چاندی کے ورق میں پیک کر کے ملتانی مٹی کے نام سے بازار میں لائیں تو اس کے خریدار بھی ہزاروں میں مل جائیں گے۔ یہ کوئی فرضی مثال نہیں ہے ایسا ہو رہا ہے۔ بازار میں ملتانی مٹی کے نام سے خوبصورت پیک میں چکنی مٹی فروخت کی جا رہی ہے۔ ایشیائی ممالک میں قوتِ خرید میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈھیرے ڈھیرے امریکہ و یورپ ہمارے باورچی خانے اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے ہیں۔ کہیں شفاف پانی یا منرل واٹر کے نام پر تو کہیں میگنیٹک صوفے کی شکل میں۔ دیہاتوں کا تعلق شہروں سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ شہروں اور گاؤں کے درمیان خلیج بڑھ رہی ہے۔ اور اسے بڑھا رہا ہے وہ سوچا سمجھا منصوبہ جسے ''بازار'' کہا جاتا ہے۔ اب بازار کی قیمتیں بھی کچھ مخصوص لوگ، کچھ مخصوص ممالک طئے کر رہے ہیں۔ ہمارا

یہاں کوئی وجود نہیں ہے اور وجود اس لئے نہیں ہے کہ عالمی منڈی میں ہمیں زبان کھولنے کا حق نہیں ہے۔ وہاں ہم بے زبان ہیں جہاں ہمیں اپنی آواز اٹھانی چاہئے۔

ہمارے سماج میں مڈل کلاس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مڈل کلاس کا مطلب ہی ایک قسم کی پیچیدگی ہے۔ مڈل کلاس، اپر کلاس کی جانب نگاہیں کئے ہوئے ہے اور اپنی حیثیت سے بے گانہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسے ناداروں سے بھی زیادہ بُرے حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں تک میں عالمی بینکوں کی شاخیں کُھل رہی ہیں۔ جن کا مقصد عام لوگوں کو قرض کے جال میں قید کرنا ہے۔ بڑے بڑے خوبصورت لفظوں میں قرض کی آسان شرطوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر پُرکشش اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی طرح عام آدمی ان اسکیموں کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ ان قرض اسکیموں کے جال میں پھنسنے کا مطلب ہے تباہی کی جانب ایک اور قدم بڑھانا۔ کریڈٹ کارڈ سسٹم بھی اسی قسم کا ایک ہتھیار ہے۔ ان بینکوں کے ذریعے ہماری معیشت پر حملہ کیا گیا ہے جس کا ہمیں احساس تک نہیں ہے۔ بزنس کلاس کے لئے بینک کاری کا یہ نظام اتنا مُضر نہیں ہے جتنا نادار طبقہ کے

لئے۔ کیونکہ ان میں سود در سود کا مہاجنی نظام قائم ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں فنانس کے اس نظام اور اس کے خطرات پر بحث بھی نہیں ہوئی ہے۔ کہنے کو یوں تو ہم عالمی بینک کاری نظام میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ اسناد بھی تو ہمیں وہی ہوگ دے رہے ہیں جو ہماری کمزوریوں سے مستفیض ہو رہے ہیں!

اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے تعلیمی نظام میں بھی آہستہ آہستہ غیر ملکی دماغوں کے اثرات داخل ہو رہے ہیں۔ ہم آنکھیں بند کر کے اگر یورپ و امریکہ کی تقلید کرینگے تو اس کے نقصانات ظاہر ہے کہ ہمیں ہی اٹھانے پڑیں گے۔ ہمارے ملک میں آج ''بایوٹکنالوجی'' پر زور نہیں ہے۔ لاکھوں ہیکٹیر زمین بنجر پڑی ہے اور ہم ان کے استعمال سے قاصر ہیں۔ ایک ہی ملک میں یہ تماشا بھی ہو رہا ہے کہ کوسی، باگمتی اور بوڑھی گنڈک ابل کر لاکھوں کسانوں کی زندگی تباہ کر دیتی ہیں اور ملک کے دیگر حصّوں میں فصلیں پانی کی کمی سے تباہ ہو رہی ہیں۔ ہم ان مسئلوں کو حل نہیں کر پا رہے ہیں۔ پانی کے بٹوارے کو لے کر ریاستوں میں گذشتہ تیس تیس برسوں سے پنجہ آزمائی ہو رہی ہے۔ تمل ناڈو اور کرناٹک اس کی مثالیں ہیں۔ کیا ابھی تک ہم ذہنی طور پر اس لائق نہیں ہوئے

کہ ان بڑے بڑے سوالوں پر سنجیدگی سے غور کر سکیں؟

سیاست ایک غلیظ گالی بن کر رہ گئی ہے۔ جس ملک میں مہاتما گاندھی اور سبھاش چندر بوس جیسے عظیم رہنما رہے ہوں وہ ملک اب بے کردار، لٹیروں اور ملک کے غدّاروں سے بھرا ہوا ہے۔ آئے دن یہ سننے میں آتا ہے کہ آج فلاں لیڈر کے گھر یا فارم ہاؤس پر چھاپا پڑا اور کروڑوں کی دولت برآمد ہوئی! سیاست کے نام پر یہ غریبوں اور ناداروں کو لوٹنے کا نسخہ نہیں ہے؟ عام انسان کا بھروسہ اب سیاست اور سیاست دانوں پر سے اٹھتا جا رہا ہے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ آزادی کے پچپن برسوں میں ہندوستان نے کتنی ترقی کی تو ہمارے پاس محض انگلیوں پر گنائے جانے والے منصوبے ہوتے ہیں۔ ہاں آبادی میں بے شک بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے۔ ان حالات میں آج ضرورت ہے تعلیمی محاذ پر جُٹ جانے کی اور منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کی۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ضلعی سطح پر اسکولوں میں آپسی ربط نہیں ہے سب اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ الاپنے میں مصروف ہیں۔ چار پڑھے لکھے لوگ کسی ایک موضوع پر متفق نہیں ہو سکتے۔ مل جُل کر کوئی تعمیری منصوبہ نہیں بنا سکتے متحدہ طور پر کوئی تحریک نہیں چلا سکتے۔ سبب ہے کہ ہم بکھرے ہوئے ہیں۔ ہماری توانائیاں ضائع ہو

رہی ہیں۔ اُن کی باتوں سے دردمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ یہ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں موجود توانائی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ترقیاتی منصوبوں کو عمل میں لانا چاہئے۔ تعلیمی میدان میں بھی ہمیں متحدہ طور پر مثبت لائحۂ عمل تیار کرنا چاہئے۔ بکھراؤ بھی ہماری شکست کا اہم سبب ہے۔

عباسی صاحب کی دانشورانہ نظر سماج و زندگی کے اُن مختلف پہلوؤں پر ہے جہاں عام انسان کی نگاہ نہیں ہوتی۔ مکمل ترقی اور کامیابی کے لئے ذہن و زندگی کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ کامیابی و ترقی کا وہ نسخہ جو یورپ میں کامیاب ہے ضروری نہیں کہ ہندوستان میں بھی کامیاب ہو جائے۔ کیونکہ ہمارے اور اُن کے طرز زندگی میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے یہاں کے موسم، یہاں کے جغرافیائی حالات، یہاں کی معاشی ضرورتیں اور یہاں موجود بنیادی وسائل یقیناً دیگر ممالک سے الگ ہیں۔ ہمیں ان حقائق کو بہر حال مدنظر رکھ کر ہی قومی اور بین الاقوامی لائحۂ عمل تیار کرنا چاہئے۔ عباسی صاحب یہ محسوس کرتے ہیں کہ شہروں کے مقابلے آج دیہات کے لوگ کنگال ہو رہے ہیں۔ قصبوں، دیہاتوں میں بوڑھوں، معذوروں اور عورتوں کے علاوہ کوئی رہنا پسند نہیں کرتا ہے کیونکہ وہاں زندگی کے بنیادی وسائل کا فقدان ہے۔ آخر ہمارے

حکمرانوں کو یہ سامنے کی تصویر کیوں نہیں دکھائی دیتی؟ یہ سوال صرف عباسی صاحب کا نہیں ہے ایک پوری نسل کا ہے جو کھلی آنکھوں سے دنیا پر نظر ڈالنے کی عادی ہے۔ اپنے آپ میں یہ سوال اکیلا نہیں ہے۔ سوال در سوال، ایک سلسلہ ہے جو ہنوز جاری ہے!

عباسی صاحب کی یہ دور اندیشی یقیناً لائق ستائش ہے کہ انہوں نے پرائمری سطح کے اسکولوں کی ترقی میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ ملک کے کونے کونے میں تعلیمی محاذ پر کام کر رہے تعلیمی ماہرین سے اُن کا رابطہ ہے۔ وہ اُن سے لگاتار صلاح و مشورہ کرتے رہتے ہیں اور پرائمری تعلیم کو آگے بڑھانے کی جانب اقدامات کرتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پرائمری سطح پر اگر تعلیم کا بہتر نظام قائم کیا جائے تو پھر اعلیٰ سطح پر تعلیمی معیار مزید بلند کیا جا سکتا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں تک پہنچتے پہنچتے ہمارے بچے اس قابل ہو جائیں گے کہ اُن کے لئے مقابلہ جاتی امتحانوں میں شرکت کرنا آسان ہو جائے گا۔

ایک مضبوط اور صحت مند معاشرے کے لئے ایک زوردار تعلیمی مہم کی ضرورت ہے۔ یہ مہم گاؤں کی سطح سے شروع ہو اور ملک گیر سطح پر پھیل جائے۔ یہ سوچنا آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا سخت مشکل کام ہے۔ عباسی صاحب اسی

مشکل کام کو آگے بڑھانے میں جُٹے ہوئے ہیں۔ اُن کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا یا نہیں، اُنہیں بھی نہیں معلوم ہے لیکن وہ محنت و کوشش میں یقین رکھنے والوں میں سے ہیں۔

تعلیمِ نسواں

جس قوم کے طبقۂ اناث کا رشتہ تعلیم گاہوں سے مضبوط ہوتا ہے وہ قوم قعرِ مذلت میں نہیں گر سکتی۔ یہ خیال ہے عباسی صاحب کا جنہوں نے عملی طور پر تعلیمِ نسواں کو عام و قابل حصول بنانے کی لئے اقدامات کئے ہیں۔ انہوں نے نے نایاب عباسی گرلز ڈگری کالج کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے جو تعلیم نسواں کے میدان میں اعلیٰ خدمات انجام دے رہا ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں عباسی صاحب خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اگر عورت تعلیم یافتہ نہیں ہے تو اس کا اثر اس کے سارے خاندان پر پڑتا ہے۔ ایک پڑھی لکھی ماں اپنے بچوں کے لئے پہلی اور کامیاب رہبر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بچوں کے دماغ پر ماں کی شخصیت بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک ماں کی زبان، فکر، ادا اور اس کا رویہ بڑی حد تک ذمہ دار ہوتا ہے بچے کی ذہنی و فکری نشو نما کا— ایک پھوہڑ اور جاہل عورت جب ماں بنتی ہے تو اس کے بچے کی ذہنی پرورش و پرداخت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ ابتدا سے ہی بغیر کسی سمت و نشان کے زندگی کے بیابان میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اس کی بنیاد ایک ایسی وراثت کی زمین پر پڑتی ہے جو نم اور ریتیلی ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اس کے دماغ سے پھوٹنے والی کونپلیں داغدار و بدرنگ ہوتی ہیں۔ اس میں بچے کا

قصور کم اور ماں باپ کا زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بچے کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہوتا ہے۔ اگر اس منزل پر بچے کو ایک اچھا اور متوازن مدرسہ مل گیا تو وہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے کا سفر طئے کرتا ہے۔ اس کی سمت متعین ہوتی ہے۔ آگے چل کر وہ اپنا نشانہ مقرر کر سکتا ہے اور منزل کے حصول کے لئے جدوجہد کا شاندار آغاز کر سکتا ہے۔ اب اس سے ہٹ کر دیگر پہلو پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایک پھوہڑ عورت اپنی گرہستی کو سنوارنے اور اسے ایک ڈھرے پر لانے میں بھی ناکام رہتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے لئے طاقت نہیں کمزوری بن جاتی ہے۔ وہ توانائی کا مرکز نہیں تباہی کا دہانہ بن جاتی ہے۔ وہ اہلِ خانہ کے علاوہ اہلِ خاندان، اہلِ محلّہ اور اہلِ بستی کے لئے بھی ایک ناکارہ فرد کی حیثیت رکھتی ہے جس سے گھر افراد اور سماجی تعمیر میں کوئی مثبت کام نہیں لیا جا سکتا۔ ٹھیک اس کے برعکس معاملہ ہے ایک تعلیم یافتہ عورت کا۔ وہ اپنے گھر کے لئے باعثِ رحمت، اہلِ خاندان کے لئے زینت، اہلِ محلّہ کے لئے عظمت اور قوم کے لے باعث شان وشوکت ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچے کی گائیڈ ہوتی ہے۔ شوہر کے لئے ہمت و شجاعت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اہل خاندان کے لے طاقت ہوتی ہے۔ خواص کے لئے نرم دل ونرم مزاج تو عوام کے لئے پیکر ہمدردی وانسانیت ہوتی ہے۔ وہ

افرادِ خانہ و خاندان کو جوڑنے کا وسیلہ بنتی ہے تو ترقیءِ نسل افزائش کا سبب بھی یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں اپنی خواتین کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔

گلوب پر نظر ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ عورتیں آج ہوائی جہاز اڑانے سے لے کر خلائی سفر میں پیش پیش ہیں۔ گھر کی حکومت سے لے کر ملکوں کی سر براہی تک بحسن وخوبی انجام دے رہی ہیں۔ بنگلہ دیش، پاکستان، سری لنکا اور خود ہندوستان میں خواتین سیاسی افق پر چمکتی ہوئی ستاروں کی مانند ہیں۔ وہ نوکر شاہوں سے کام لینا بھی جانتی ہیں اور اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت میں بھی کلیدی رول ادا کر رہی ہیں۔ اب تو آلاتِ حرب بنانے والی کمپنیوں سے لے کر، تعلیم و تعلم، صحت و تحقیق اور دفتری امور میں عورتوں نے جس انہماک کا ثبوت دیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عورتیں انسانی معاشرے کا چھپا ہوا خزانہ ہوں جن کی رونمائی نئے حالات کے تحت نئی افق پذیری سے ہو رہی ہے۔

میں قوم کی بیٹیوں کو سیدھے خلائی مشن پر بھیجنے کی تبلیغ نہیں کر رہا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس میں ابھی دیر ہے۔ ہم اس میدان میں ابھی بہت

پیچھے ہیں۔ ہماری عورتیں اپنے محلے کے بازار سے سودا سلف لانے کی ہمت نہیں جٹا پاتیں۔ اپنے گھروں میں اخبار خریدے جانے کی ضد نہیں کرتیں۔ اپنے بالغ بچوں تک کو آس پاس کے قصبوں، شہروں میں آنے جانے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتیں۔ اپنے شوہروں کو گھر سے باہر آس پاس کے کسی محلے، بستی تک میں آنے جانے کے موقع پر نذرا تارنا نہیں بھولتیں۔ ایسے میں اُن کے بچوں کو اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کی صلاح دینا قبل از وقت ہے۔ ہاں اُنہیں میں ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو ان پڑھ، ان گڑھ نہ رہنے دیں۔ اُنہیں جس حد تک ممکن ہو تعلیم ضرور دلائیں، تعلیم کی روشنی گھر میں آئے گی تو اہلِ خانہ اور سماج کی صحت بھی اچھی رہیگی پھر اعلیٰ تعلیمی سرگرمیوں کی فضا سازگار ہوگی۔ جب آج سے ڈیڑھ سو برس قبل سر سید احمد خاں ملک کے کونے کونے کا سفر کر کے مسلم خواتین سے اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی بات کرتے تھے تو اُن کے خلاف آوازیں اُٹھتی تھیں۔ اُنہیں بُرا بھلا کہا جاتا تھا اور کوئی الزام ممکن نہ تھا اس لئے اُنہیں نیچری کہہ کر مسترد کر دیا جاتا تھا۔ لیکن وقت نے اُن کوتاہ بینوں کو غلط ثابت کر دیا۔ سر سید کی کوششیں کی بار آور ثابت ہوئیں اور آج علیگڑھ تحریک ملک کیا، دنیا بھر میں مقبول خاص و عام ہے۔ ضلع اور ریاستی سطح پر

اسکولوں اور اداروں کی بڑی لمبی فہرست ہے۔ اب تعلیم کی مخالفت بھی شدید تر نہیں ہے۔ لیکن مسلم سماج میں فضا اب بھی اتنی سازگار نہیں ہے۔ کم سے کم امروہہ اور اس کے ارد گرد کا وہی تناظر یہی ظاہر کر رہا ہے کہ لوگ اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی جانب ابھی متوجہ نہیں ہوئے۔ کچھ لوگ اگر بیدار ہوئے بھی ہیں تو اُن کے پاس وسائل کا فقدان ہے اس میں ایک طبقہ تو ایسا بھی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اکی بچیاں بس کسی طرح گریجویشن کی ڈگری لے لیں تا کہ اُن کی شادی آسانی سے ہو سکے۔ وہ اُس ڈگری کو اپنی بچی کے اوصاف کے طور پر پیش کر کے مناسب رشتے حاصل کر سکیں۔ میری نظر میں یہ کوئی بُری بات نہیں ہے لیکن یہ تعلیم کا سب سے معمولی استعمال ہے، یہ بس ایسا استعمال ہے جیسے مرسیڈیز کار سے ڈھوروں ڈنگروں کا چارہ ڈھونے کا کام لیا جائے۔ مجھے اس سے اچھی کوئی دوسری مثال نہیں سوجھتی۔ قوم کے اس حال پر رونا آتا ہے لیکن پل جھپکتے میں ذہنوں کو نہیں بدلا جا سکتا، یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے۔"

عباسی صاحب امروہہ اور اہلِ امروہہ کا ذکر جس ہمدردی و محبت سے کرتے ہیں اس سے اردو کے نامور ادیب رشید احمد صدیقی کی یاد آتی ہے۔ وہ علیگڑھ کو اسی تواتر اور محبت سے اپنی تحریروں میں سموتے ہیں۔ ذکر ہو رہا ہوگا

لندن کے گلاب کا اور بات علیگڑھ کے گلاب کی برتری پر ختم ہوگی۔ عباسی صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ سرزمین امروھہ سے محبت وعقیدت کا یہ حال مرحوم جون ایلیا میں دیکھنے کوملتا تھا۔ (ناچیز کی جون ایلیا مرحوم سے امروھہ میں محرم کے موقع پر طویل ملاقاتیں رہیں۔ مرحوم امروھہ کے چپے چپے سے اُنس رکھتے تھے۔ یہاں کی گلیاں، یہاں کے محلے جون صاحب کو کراچی سے کھینچ کر امروھہ لاتے تھے۔ اُن سے ایک طویل اور دلچسپ ملاقات ان کی بھانجی ھُما صاحبہ کے لکھنو واقع مکان میں ہوئی تھی۔ وہی اُن سے آخری ملاقات ثابت ہوئی! ع ذکر تھا محبت کا اور ہم کہاں پہنچے۔)

عباسی صاحب کے اسی والہانہ پن کا نتیجہ ہے کہ امروھہ کی خواتین انہیں پیار سے ''بھائی صاحب'' کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ عباسی صاحب خود میں ایک تحریک ہیں۔ ایک پیغام ہیں۔ تعلیمِ نسواں اُن کا پسندیدہ موضوع ہے۔ آپ سے تعارف ہوگا اور باتوں ہی باتوں میں وہ آپ کی بچیوں کی تعلیم کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہونگے اور آپ کو ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے جائیں گے کہ آپ اپنی بچی کو اعلیٰ تعلیم کہاں اور کس طرح دلا سکتے ہیں اور اُس کے کیا فائدے ہیں۔ اُن کا یہ ذہن ایک دن میں نہیں بنا۔ برسوں انہوں

نے اس موضوع پر سوچا ہے۔ ہزاروں لوگوں سے ملک و بیرون ملک تبادلہ خیال کیا ہے۔ مطالعہ کیا ہے۔ تب جا کر بعض نتائج مستخرج کیے ہیں۔ اُن کے خیال میں وزن ہے، باتوں میں دم ہے۔ خوش قسمتی سے ان کی جدوجہد کا مرکز ہندوستان کا دارالخلافہ یعنی شہر میر و میرزا (دہلی) رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہیں بہتر سوچنے والے، اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک، حضرات سے تبادلۂ خیال کے مواقع میسر رہے ہیں۔ یہی نہیں، ہندوستان کے باہر سینکڑوں یوروپی ممالک کے اسفار نے انہیں جس سوچتے ہوئے ذہن کا مالک بنا دیا ہے اور جو اندازِ نظر اُن میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ ذہن کا ایک دریچہ ہمیشہ کھلا رکھتے ہیں۔ انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فکر و جذبے کے بہتر ادغام سے عالمی سطح کے افکار کا جنم ہوتا ہے۔ بہتر ادب، فلسفے اور بہتر طرز زندگی کی رہنما تحریریں کشادہ ذہن اور خلاقانہ مزاج کی مرہون منت ہیں۔ عباسی صاحب تہذیب، زبان و ادب کے بہترین قدردانوں میں ہیں۔ کتابوں کے مطالعہ کا انہیں سُتھرا ذوق ہے۔ یہ عوامل ان کی شخصیت کو متوازن بناتے ہیں، انفرادیت بخشتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بھیڑ میں الگ دکھائی دیتے ہیں۔

کالج کا قیام (تعلیمِ نسواں کے میدان میں عملی قدم)

اب سے دو دہائی قبل عباسی صاحب کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اہلِ امروھہ کے لئے تعلیمی میدان میں کچھ ٹھوس کام کیا جائے۔ انہوں نے اپنے ہم خیال لوگوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ لوگوں نے اس خیال سے اتفاق ظاہر کیا کہ امروھہ میں لڑکیوں کا ایک کالج قائم کیا جائے اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کئی سماجی تنظیموں کا ذکر بھی آیا۔ عباسی صاحب نے لڑکیوں کے کالج کے قیام کے لئے ایک بڑی رقم کا اعلان کیا لیکن بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ لوگ اچھی اور فکر انگیز خیالات پر تالیاں بجانے کا ہُنر تو رکھتے ہیں لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے جس غیر معمولی لگن اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اُس سے عاری ہیں۔ چند برسوں کے انتظار کے باوجود جب عملی سطح پر کچھ ہوتا ہوا نظر نہیں آیا تو عباسی صاحب نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا جس کے مطابق زمین کا ایک بڑا خطّہ چاہئے تھا جہاں کالج کی عمارت بن سکتی۔ اس سلسلے میں چند مقامی ساتھیوں کی مدد سے کام شروع ہوا۔ ایک ایک قطعۂ اراضی کے لئے عباسی صاحب اور ان کے رفقا کو لوہے کے چنے چبانے پڑے۔ کیونکہ زمین کا ایک سو بیگھے کا قطعہ کسی ایک شخص کے پاس نہیں تھا۔ سینکڑوں لوگوں کے آپسی معاملات نمٹاتے ہوئے زمین کی خریداری کا کام

جاری رہا۔ تقریباً دس بارہ برس کی ریاضت کے بعد ایک سو سات بیگھے پر مشتمل قطعۂ اراضی کالج کے لئے حاصل کرلیا گیا۔ اور پھر شروع ہوا عمارت کی تعمیر کا سلسلہ جو ہنوز جاری ہے۔ اب تو ایک عالیشان عمارت وجود میں آچکی ہے۔ جہاں مختلف ڈگری کورسز کا آغاز ہو چکا ہے۔ ملک کے کونے کونے سے ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جس کے نتیجے اب سامنے آرہے ہیں۔ گذشتہ سال کالج کا رزلٹ ۹۷٪ فیصد تھا جو ضلع میں سب سے اچھا فیصد ہے۔ شہر میں ہی واقع دیگر کالجوں سے تقریباً پندرہ فیصد بہتر رزلٹ دینے والا یہ کالج امروہہ کی ناک مانا جاتا ہے۔ کالج سے امروہہ اور دہلی کے بہترین صلاحیتوں کے لوگ مختلف انداز میں وابستہ ہیں۔ ملک کے مایہ ناز اطباء صحافی حضرات، ماہرین تعلیم، اساتذہ اور ساجی کارکنان کی وابستگی نے کالج کے تعلیمی معیار کو کہیں سے کہیں پہنچادیا ہے۔

ترقیٔ معکوس

گذشتہ سو برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں جس قسم کی ترقی ہوئی ہے شاید ایسی برق رفتار ترقی گذشتہ پانچ سو برسوں میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ شمالی انٹارٹکا سے لے کر بالی جیسے چھوٹے اور گمنام جزیروں تک میں معلومات ومواصلات کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انٹرنیٹ کے ذریعے ہم دینا کے کسی بھی حصّے میں واقع لوگوں، تعلیم گاہوں، تاریخی عمارتوں، کتب خانوں اور رسومات و ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور لمحوں میں طویل سے طویل تر خطوط، مضامین اور تصاویر کا تبادلہ بھی انٹرنیٹ کے ذریعے ممکن ہو گیا ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے طفیل دنیا میں جیسے ایک انقلاب سا آ گیا ہے۔ اس انقلاب نے حصولِ علم اور فروغِ تجارت کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ دنیا ایک گلوبل ویلیج یا عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ جس کا آسان اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ ویب سائنس کے ذریعے تمام دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے مربوط ہوگئے ہیں۔ یہ وابستگی ایک نئے احساس اور ایک نئی معنویت کی حامل ہے۔ زندگی برق رفتار ہوگئی ہے۔ مہینوں کا کام گھنٹوں اور گھنٹوں کا کام لمحوں میں ہو رہا ہے۔ علم وفن کی ان ضو باریوں کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے مسٹر عباسی اسے

انسانی ارتقاء کی راہ میں سنگ میل مانتے ہیں لیکن ان برکتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود آج کے انسان کا دامنِ اعتماد و اعتبار کے خزانے سے تہی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جس ترقی و کامرانی کو انسانی زندگی کی بہتری اور سکون کے لئے استعمال کیا جانا تھا وہی مادی عیشِ کوشی کی جانب مائل ہے۔ جسے تہذیبی نقطۂ نظر سے زوال آمادہ کہنا چاہئے۔

بادی النظر میں عباسی صاحب کا نئ ترقی و کامرانی اور اس سے وابستہ انقلابات پر تبصرہ ذراسخت معلوم ہوتا ہے لیکن بہ نظرِ غائر دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ آج مادیت پرستی نے انسانی ذہن کو جیسے اپنا غلام لیا ہے۔ انسان کا مقصد مادیّت پرستی بنتا جارہا ہے۔ جو نہایت افسوس کی بات ہے۔ اگر اس مادیّت پرستانہ نظر کا عالمی سطح پر جائزہ لیں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ انسان چلتی پھرتی مشین بن گیا ہے۔ ایسی مشین جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ مادی اشیا کو اکٹھا کرنا اور اپنے زیرِ نگیں کرنا ہے۔ یہ انسان کی اسی جبلّت کی ایک شکل ہے جو کسی زمانے میں اس طرح رائج تھی کہ طاقتور لوگ زیادہ سے زیادہ اشیائے خورونی، رہائشی علاقے اور کھیتی باڑی کے لائق زمینیں اپنے قبضے میں کرنے کے لئے جان تک کی بازی لگادیتے تھے۔ آج کا عالم بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ زیادہ اشیا،

ہتھیار اور زمینوں پر اپنی اطاعت گذاری تھوپنے کے لئے نئے نئے حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جلی ہوئی انسانیت کی پروا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر آٹے میں نمک کے برابر کچھ لوگ ہیں بھی تو وہ سماج کو متاثر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

بیسویں صدی پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر دس بیس سال میں کوئی نہ کوئی جنگ شروع ہو جاتی ہے جس میں لاکھوں انسانوں کی جان اور اربوں ڈالر کا نقصان ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جنگ تھوپنے والے ممالک اور ان کے حمایتی معاون سربراہانِ مملکت ہر جنگ کی ناگذیریت کے جواز دنیا کے سامنے پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جنگ لادنے والے ممالک برسوں جنگ کی تیاری میں جٹے رہتے ہیں۔ زبردست قسم کے منصوبے بناتے ہیں۔ ہتھیاروں کی تیاری میں اپنے ممالک کے خزانے کا ایک بڑا بجٹ جھونک دیتے ہیں۔ سرکاری خزانوں کی وہ رقمیں جو غریبی، بدحالی، بیماری، بھوک اور قدرتی آفات سے لڑنے میں خرچ کی جانی چاہئیں اسے مہلک ہتھیاروں کی تیاری میں لگا دیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں آج دنیا بھر میں بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بیماریوں کے دائرۂ اثر میں زیادہ سے زیادہ لوگ آ رہے ہیں۔

سینکڑوں بے نام و بے پہچان بیماریوں نے انسانی آبادی کا رُخ کر لیا ہے۔
ایتھوپیا اور کالا ہانڈی جیسے ہزاروں مقامات آج بھی گلوب کے نقشے پر افلاس و
بدحالی کی تصویر بنے انسانی ترقی و تعمیر کے دعووں پر سلگتے سوال کھڑا کر رہے
ہیں۔ اُن سوالوں سے نظریں دو چار کئے بغیر عالمی ترقی کے کسی بھی آنکڑے
کو قبول کرنا عقل و دانش کی روشنی پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے لے کر حالیہ عراقی جنگ تک کا اگر
منصفانہ جائزہ لیں تو ان تمام جنگوں میں مضمر بعض عناصر کی یکجائی و یک صورتی
نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل نکات دیکھیں۔

۱۔ اپنے حریف کو زیادہ سے زیادہ جانی و مالی نقصان پہنچانا
۲۔ جنگ جیتنے کے لئے ہر قسم کے جھوٹے پیروپگنڈے کو جائز سمجھنا
۳۔ جنگ میں ہر طرح کے جھوٹ، مکر اور فریب کو جائز متصور کرنا
۴۔ خود کو امن کا علمبردار اور حریف کو دہشت گرد اور عالمِ انسانیت کے لئے خطرہ ثابت کرنا
۵۔ جنگ کی ناگزیریت ثابت کرنا
۶۔ جنگ میں کامیابی کے بعد زیادہ سے زیادہ مالی منفعت کے حصول کو

ترجیح دینا۔

اہلِ نظر اس حقیقت پر صاد کرینگے کہ دنیا کی تمام بڑی جنگوں میں مذکورہ عناصر موجود رہے ہیں۔ تہذیبی ترقی کے تمام دعوے وفلسفے ایک طرف اور جنگی حکمت عملی، جنگ نقطہ نظر اور جنگ کی وقوع پذیری دوسری طرف۔ عباسی صاحب کا یہ کہنا کہ تاریخ میں پلڑا جنگ کے حامیوں کے حق میں جھکتا رہا ہے۔ اور امن کے علمبرداروں کی صدائیں نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی ہیں، صدفی صد دُرست معلوم ہوتا ہے۔

مسٹر عباسی دنیا کے تمام تہذیبی و ترقی کے موضوع پر کام کرنے والے عالموں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ایک طرف انسانی جسموں کے چیتھڑے اڑا دینے والی بمباری کرنا اور دوسری طرف کھانے کے پیکٹ مجبور و بے بس لوگوں کی طرف اچھالنا، کونسی تہذیبی معراج ہے۔ ایک طرف تو لاکھوں بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور بزرگوں کو بے درو بے گھر کر کے سڑک پر ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کرنا اور پھر کھانے کے پیکٹ کی شکل میں بھیک دے کر ہمدردی جتانا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ کیسی انسانیت ہے؟ یہ کیسی ترقی ہے؟

آخر اس بچے کا مستقبل کیا ہے جس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں

بمباری کی نذر ہو گئے۔ جس کے ماں باپ جنگ کے نام پر ہونے والی وحشت زدگی کے شکار ہو گئے؟ کیا آپ کے ذریعے فراہم کردہ یتیم خانے اس بچے کے بھاگنے، دوڑنے، شرارت کرنے، اپنے ننھے منے ہاتھوں سے تتلیوں کو پکڑنے، اور کسی آوارہ پتنگ کے چھت پر آگرنے سے خوش ہو کر تالیاں بجانے کے خواب کو پورا ہونے دینگے، اور اس نئی نویلی دلہن کا کیا ہوگا جس کا شوہر اس کی آنکھوں کے سامنے خون میں لت پت اپنی سانسوں کی ڈور ہار بیٹھا، سینے میں لگی گولی نے جسے اپنی نئی دُلہن کو تسلی کے دو بول بولنے کی بھی مہلت نہیں دی؟ کیا ٹیلی ویژن پر ایک نیا تلا، چالا کی بھرا ہمدردی کا بیان ہی اُن غموں کا مداوا ہو سکتا ہے۔ پارلمنٹوں میں چند لمحوں کے لئے کی گئی جذباتی تقریر کو اس پیچیدہ مسئلے کا حل کہا جا سکتا ہے؟ دنیا جو کہے سو کہے۔ مسٹر عباسی کا جواب نہیں میں ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کسی بھی مسئلے کے کئی رُخ ہیں اور کسی بھی ایک یا ایک سے زیادہ رُخوں پر بیانات جاری کئے جا سکتے ہیں۔ ہمدردی کے بول بولے جا سکتے ہیں۔ لیکن جلی ہوئی انسانیت لوٹائی نہیں جا سکتی۔

جنگ کے بھیانک نتیجوں پر بولنے کے لئے مسٹر عباسی کے پاس بہت مواد ہے۔ جانی و مالی نقصانات کے آنکڑے ہیں۔ تباہ شدہ عمارتوں،

سڑکوں، پلوں، گاڑیوں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اسٹیشنوں اور مواصلاتی نظام کی تفصیلات تو ہیں ہی لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے اندر جنگ کے خلاف ایک آتش فشاں ہے جو پھٹنے کو تیار ہے۔ وہ سخت سے سخت لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اور خوب کرتے ہیں۔ لفظ اردو، انگریزی اور ہندی کے ہیں۔ لفظ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ لفظ طاقتور ہیں۔ دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دینے والے لفظ، فضا میں ارتعاش پیدا کرنے والے لفظ۔ رنگ برنگے، انوکھے، عجیب، معمولی، غیر معمولی، ادبی اور شاعرانہ...... مگر لفظ ختم ہو جاتے ہیں! بیانِ جاری ہے۔ اب بیان کی زبان ہے خاموشی اور طویل خاموشی!!

ایلیٹ سے لے کر ایذرا پونڈ تک اور بودلیر سے لے کر قرۃ العین اور کرشنا سوبتی تک ... سب جنگ کے خلاف ہیں۔ مگر جنگ جاری ہے!!

مسٹر عباسی کا سوال ہنوز قائم ہے کہ نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی برقی قمقموں میں نہائی ہوئی دنیا نے جو ترقی کی ہے کیا اسے خالص ترقی مانا جائے۔ یہ ترقی ہے یا ترقئ معکوس؟؟

ایک نفیس خواب اور

عباسی صاحب نے اپنی زندگی میں محنت، ایمانداری اور ذہانت کے

بل بوتے پر قابلِ فخر کامیابی حاصل کی ہے۔ نایاب عباسی گرلز ڈگری کالج ان کے ایک اور نفیس خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے محض کالج تک بنانے کا خواب نہیں دیکھا ہے بلکہ وہ اسے یونیورسٹی تک لے جانے کی سوچ رکھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اس کام میں مزید دو دہائی کا وقت لگے گا۔ ابتداء میں قطعۂ اراضی کے حصول میں آنے والی مشکلوں نے بتلا دیا تھا کہ یہ کام ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں ہے۔ اور اس مقام پر مستقل مزاجی کا ثبوت دے کر عباسی صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ راہ میں مُڑ مُڑ کر پیچھے دیکھنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ اُنہیں معلوم ہے کہ

ع لغزش کے ارادوں کو منزل نہیں ملتی ہے۔

کالج کی دن دونی رات چوگنی ترقی کا خواب دیکھنے والے نفیس عباسی نے کالج کی شاندار عمارتوں کی تعمیر میں کسی کی مالی مدد نہیں لی ہے۔ انہوں نے تمام اخراجات خود ہی اٹھائے ہیں۔ دور دیہاتوں سے آنے والی طالبات کے لئے انہوں نے بسوں اور دیگر گاڑیوں کا مفت انتظام کیا ہے تاکہ امروہہ سے بیس، تیس کلومیٹر کے فاصلے پر رہنے والے ماں باپ اپنی بچیوں کو مسافت کی پریشانی کے سبب تعلیم سے محروم نہ رکھیں۔ انہوں نے غربت و افلاس کی شکار

طالبات کے لئے کالج میں ایک الگ امدادی فنڈ قائم کیا ہے جس سے سینکڑوں
طالبات مستفیض ہورہی ہیں۔ گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ کالج کی شہرت میں
خوشگوار پراضافہ ہورہا ہے۔ جے پی نگر کے علاوہ دیگر اضلاع سے بھی طالبات
یہاں داخلے کی خواہش مند ہیں۔ عباسی صاحب نے اس ضرورت کو محسوس
کرتے ہوئے ہاسٹل کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جواس سال ہی بن کر تیار
ہو جائے گا جس سے دیگر اضلاع اور ملک کے دیگر حصّوں سے بھی طالبات
حصول تعلیم کے لئے آسکیں گی۔ اورامروہہ تعلیم کے شیدائیوں کا ایک اہم مرکز
بن سکے گا۔ عباسی صاحب کا خواب ہے کہ وہ امروہہ کو تعلیمی مرکز کے طور پر ملک
اور دنیا میں پیش کرسکیں۔ اسے تعلیم نسواں کا علیگڑھ کے بعد سب سے بڑا مرکز بنا
سکیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ کاروباری مصروفیت سے انہیں اتنا وقت نہیں ملتا ہے
کہ وہ مستقل طور پر صرف کالج کی تعمیر و ترقی کے پروجکٹ میں لگا سکیں۔

بہر حال یہ بات اپنے آپ میں اہم ہے کہ ایک شخص کی انفرادی
کوششوں سے ایک بڑا اور مایہ ناز ادارہ وجود میں آچکا ہے۔ یہ کام قوم کا تھا
لیکن ... ہم سب واقف ہیں کہ ہمارا ملّی اتحاد افسوس ناک حد تک پارہ پارہ ہو
چکا ہے۔ ہم آج بھی بہ قول علامہ اقبالؔ

ع گفتار کے غازی بن تو گئے کردار کے غازی بن نہ سکے۔

نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم تقریر اور تنقیص میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں، تعمیر و تجدید میں نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک ملّت کے طور پر ہم اپنی چھاپ نہیں چھوڑ پا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور جرگوں میں بٹے ہوئے لوگ حکمرانی کے جذبے سے اکثر محروم ہو جایا کرتے ہیں۔ ایشیائی قوموں میں سے صرف مسلم قوم ایسی ہے جو اب بھی ماضی میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ اسے حالات کے تپتے صحرا میں دو قدم چلنے کی سکت نہیں ہے۔ عہد رفتہ کے نوحے ہمیں سکون دیتے ہیں۔ قوم کی اس حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے عباسی صاحب کبھی کبھی تلخ ہو جاتے ہیں کہتے ہیں ''بھیا'' اپنی قوم منّ سلویٰ کے انتظار میں رہتی ہے۔ محنت سے اسے بیر ہے۔ لگن سے دشمنی ہے حوصلے سے ناچاقی ہے۔ اگر اسے کوئی کھلانے پر ہی مُصر ہو جاتے تو یہ کھانے کے بعد دسترخوان بھی سمیٹ لے جائیں۔ انہیں قدم قدم پر مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ اپنی آپ مدد کے فارمولے پر کبھی عمل نہیں کرتے۔ مبالغہ ان کی سرشت میں شامل ہے۔ ہوائی گھوڑے دوڑانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زندگی کے دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں'' عباسی صاحب کی باتیں ذرا کڑوی ہیں لیکن حقیقت

پر مبنی ہیں۔ اگر ہم ایمانداری سے اپنے اِردگرد کا جائزہ لیں تو ہمیں ان کا کہا ہوا ایک ایک لفظ سچا معلوم ہوگا۔ یہ خیالات اس شخص کے ہیں جسکی زندگی جدوجہد کی ایک مثالی زندگی ہے۔ امروھہ سے لے کر امریکہ تک جسکے پسینے کی خوشبو نے زندگی کو نئے معانی عطا کئے ہیں جو آج بھی اٹھارہ گھنٹے محنت کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ جو آج بھی اپنے آپ کو ایک معمولی انسان سمجھتا ہے۔ جسکی رگوں میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جو دوسروں کا دکھ بانٹنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ جس نے اپنی کامیابی کی ہر تحریر اپنے پسینے کی سیاہی سے لکھی ہے۔ جو آج بھی اسراف سے اجتناب کرتا ہے۔

اس عمر میں بھی جس انہماک کے ساتھ عباسی صاحب کام کرتے ہیں اسے دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہاں اس شخص کو خواب دیکھنے کا حق حاصل ہے۔ وہ محنت کو ریاضت و عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ محنت پر لوگوں کو راغب کرتے ہیں۔ محنت کرنے والوں کی قدر کرتے ہیں۔ محنت کشوں کی مشکلوں کو سمجھتے ہیں۔ اُنہیں محنت کش طبقے کی پریشانیوں، محدودیّت اور پیچیدگی کا مکمل ادراک ہے۔ آج ایر کنڈیشنڈ ٹویوٹا میں سلیقے سے سیٹ بیلٹ لگا کر سفر کرتے ہوئے وہ یہ نہیں بھولتے ہیں کہ کبھی وہ دو جون کی روٹی جگاڑنے کے لئے میلوں کا پیدل سفر طئے

کرتے تھے۔ تن پر نہایت معمولی کپڑے بھی انہوں نے پہنے تھے۔ وہ اپنا وقت بھلا نہیں پاتے اور اپنے دورِ افلاس کو چھپاتے بھی نہیں ہیں۔ اُنہیں یہ بتانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی کہ وہ ایک غریب گھر کے چشم و چراغ ہیں جہاں فارغ البالی کے صرف سپنے دیکھے جاسکتے تھے۔ انہیں یاد ہیں وہ مجبوریاں، وہ بے بسی جب وہ خواہش کے باوجود تعلیم حاصل نہیں کر سکے تھے کیونکہ ملازمت ہی اُن کے رزق کا وسیلہ تھا۔ قابلِ تحسین پہلو یہ ہے کہ اُن کی غربت اُن کی راہ کا پتھر نہیں بن پائی، وہ عزمِ مصمم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور کامیابیاں ان کے بیاضِ مقدر میں تحریر ہوتی رہیں۔

حالات کے طوفان کا رُخ موڑنے والے کبھی حالات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوتے، یہ سبق عام ہے عباسی صاحب کی کتابِ زندگی کا۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نو دولتیے، دولت کے نشے میں چور ہو کر اپنی حدوں سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ دیگر انسانوں کو وہ حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وحشت زدہ زندگی دوسروں کے لئے نمونۂ عبرت ہوتی ہے۔ شکر ہے عباسی صاحب میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھے، سچے اور سادگی پسند انسان ہیں۔ ہمیشہ مخاطب کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہیں۔ عام انسانوں کے عیبوں کو نظر

انداز کرنا اور خوبیوں کو اجاگر کرنا کوئی اُن سے سیکھے۔ موٹے طور پر وہ ایک مثبت فکر کے انسان ہیں۔ یہی مثبت فکری اُنہیں ہر دم رواں ہر دم جواں بنائے رکھتی ہے۔ فائدہ ہو یا نقصان، کامیابی ہو یا ناکامی عباسی صاحب کو آپ کبھی کفِ افسوس ملتے نہیں پائیں گے۔ ماضی کا احتساب کرتے ہوئے مستقبل پر نظر رکھنے والوں میں سے ایک ہیں عباسی صاحب۔ یہی اُن کی کامیابی کا راز بھی ہے۔

دیگر اہم منصوبے

کالج کے قیام کے ساتھ ہی عباسی صاحب کے ادارہ سازی کے

تجربے میں بھی اضافہ ہوا ہے۔احباب سے لے کر نوکر شاہی تک کے بعض تلخ تجربے بھی ہوئے ہیں لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔اُن کے حوصلوں میں مزید اضافہ ہوا ہے۔وہ اس کالج کو مزید مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اسکول کے منصوبے پر بھی کام کر رہے ہیں۔ان کا خواب ہے کہ وہ ایک ایسا اسکول بنائیں جسکی ریاستی وملکی سطح پر مثال دی جائے۔

اسکول:

امروھہ کالج کیمپس میں ہی اسکول کی عمارت بنانا چاہتے ہیں عباسی صاحب۔اسکول کی عمارت اوراس سے وابستہ کھیل کا میدان اور دیگر عمارات بھی تعمیر کی جائیں گی۔ان کی کوشش ہے کہ یہ ایک ایسا ادارہ ہو جہاں ایک بار اگر بچہ کا داخلہ ہو جائے تو وہ اپنی کالج کی تعلیم مکمل کر کے وہاں سے زندگی کے عملی شعبوں میں قدم رکھے۔پروجیکٹ جتنا وسیع ہے،وقت بھی اُسی کے حساب سے لگ رہا ہے۔لیکن امید کی جانی چاہئے کہ دو ہزار دس تک یہ اسکول بھی وجود میں آجائے گا جس سے ہزاروں،لاکھوں تشنگان علم اپنی پیاس بجھا سکیں۔فی الحال منصوبہ کے بنیادی خاکے پر کام ہو رہا ہے۔

مُسافر خانہ:

اسکول کے علاوہ عباسی صاحب برسوں سے یہ سوچتے آرہے ہیں کہ کیوں نہ دھرم شالاؤں کی طرز پر امروہہ میں ایک مسافر خانہ کی تعمیر کی جائے تا کہ وہاں آنے والوں کے قیام میں پریشانی نہ ہو۔ اس خواب کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے امروہہ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ایک قطعۂ اراضی بھی خرید لیا ہے۔ مسافر خانے کی تعمیر کا کام ابھی شروع نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ ابھی کالج میں ہاسٹل اور دیگر تعلیمی مراکز کی تعمیر جاری ہے۔ اس تعمیری منصوبے کو ایک بلندی تک پہنچا کر وہ نئے تعمیری منصوبوں پر عمل پیرا ہونگے۔ لیکن ان کی دلی خواہش ہے کہ تعمیرات کا کام جلد از جلد شروع ہو۔ یہ مسافر خانہ امروہہ کا پہلا مسافر خانہ ہوگا جہاں انتظامی امور کی مد میں برائے نام کرایہ لیا جائے گا۔ اس پروجیکٹ کو عباسی صاحب کمائی کا ذریعہ نہیں بنانا نہیں چاہتے۔ یہ منصوبہ مفاد عامہ کے لئے ہے۔ اور خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت اسے پورا کیا جائیگا۔

یونیورسیٹی:

مسافر خانہ کے علاوہ عباسی صاحب نایاب عباسی گرلز ڈگری کالج کو مزید ترقی دے کر یونیورسٹی کی سطح تک لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کی دلی خواہش ہے کہ امروہہ میں یہ تعلیمی مرکز ایک یونیورسٹی کی شکل اختیار کرے اور امروہہ

دنیا کے نقشے پر ایک اعلیٰ تعلیمی مرکز کے طور پر ابھرے۔ کالج کیمپس میں تعمیرات کا یہ لامتناہی سلسلہ اُن کے فکر کا غماز ہے۔ وہ دن دور نہیں جب یہ کالج یونیورسٹی کی بلندی کو چھو لے گا۔

اُردو دوستی

جب کسی معاشرے کا ادبی ذوق دم توڑنے لگے تو اُس معاشرے کی
تہذیب زوال آمادہ ہو جاتی ہے۔ تاریخ عالم کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے

آتی ہے کہ سینکڑوں سال میں ایک اعلیٰ تہذیب پنپتی ہے، پروان چڑھتی ہے اور اپنی شناخت بناتی ہے۔ وقت کے ساتھ اسے عروج حاصل ہوتا ہے اور پھر اگر فضا سازگار رہے تو یہ اعلیٰ وارفع تہذیب صدیوں تک اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ لیکن اگر حالات ناسازگار ہیں تو تہذیب دم توڑنے لگتی ہے۔ انسانی معاشرے میں تہذیبوں کی ترقی وتنزلی کے ایک خاص معنی ہوتے ہیں۔ اس لئے دنیا کی بہترین ذہانتیں ہر عہد میں تہذیبی وثقافتی ترقی کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔

عباسی صاحب کے گہرے مطالعہ اور تیز مشاہدے نے اُنہیں ادب و آرٹ کا سچا پارکھی اور دلدادہ بنادیا ہے۔ وہ ادب وآرٹ کی ترقی کے لئے ہر سطح پر کوشاں رہتے ہیں۔ ادب وآرٹ کی خدمت کرنے والوں کو وہ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اہل علم وہنر کے ایک بڑے طبقے کے نزدیک عباسی صاحب کی یہی پہچان ہے۔ وہ اخبار ورسائل ہوں یا علمی ومعلوماتی کتابوں کی اشاعت کا معاملہ، عباسی صاحب اس میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنی سطح پر ہر عملی تعاون دینے میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ''ادب وآرٹ کو ذہنی زندگی کی لائف لائن کہا جاسکتا ہے۔ انسان، اشرف المخلوقات اس لئے ہے کہ وہ سوچ سکتا ہے، وہ اپنے خیالات کا اظہار مختلف ذرائع سے کرسکتا ہے۔

لہٰذا ادب و آرٹ، موسیقی و شاعری، انسانی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ زندگی میں رنگ بھرتی ہے۔ زبان کو مٹھاس دیتی ہے تو لہجہ کو خوشبو۔ ادب ہماری ذہنی زندگی کا آئینہ بھی ہے اور عکس بھی۔''

یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اپنا زیادہ تر وقت تجارتی معاملات میں گذارنے والے عباسی صاحب ادب و آرٹ کے بارے میں انتہائی سنجیدہ اور باوقار خیالات رکھتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہمارا اہلِ ثروت طبقہ ادب و آرٹ کے تقدّس کا اتنا ہی قائل و گرویدہ ہوتا! موجودہ عہد میں چونکہ بازار ''زندگی'' کا ایک بڑا سچ ہے۔ اور اہمیت و افادیت کا پیمانہ بھی۔ لہٰذا آج ہر شئے بِکاؤ ہے۔ بات ذرا کڑوی ہے لیکن سچ ہے۔ آج ادب و آرٹ کی قیمت بھی بازار میں طئے ہوتی ہے۔ معمولی اور لچر قسم کی تحریریں بھی بڑے بڑے اعزازات اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہیں کیونکہ ان تحریروں کے خالق، بازار کی نبض پر اُنگلی رکھنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ وہ بازار کی زبان بھی سمجھتے ہیں اور لہجہ بھی۔ وہ ہوا کا رُخ اپنے حق میں موڑنا جانتے ہیں۔ یہ بات ضلعی سطح کی انجمنوں سے لے کر صوبائی اکیڈمیوں اور پھر ملکی سطح کی اکیڈمیوں پر صادق آتی ہے۔ گذشتہ ایک دہائی میں کتابوں پر دیئے گئے انعامات و اعزازات کی فہرست اس حقیقت

کواُجاگر کرنے کے لئے کافی ہے۔ اردو کے معروف نقاد فُضیل جعفری، وارث علوی، عظیم الشان صدیقی اور زبیر رضوی جیسے سنجیدہ ادیب و شاعر کا یہ ماننا ہے کہ کم از کم اردو زبان میں انعامات و اعزازات کی با قاعدہ ایک منڈی ہے جس پر کچھ لوگ برسوں سے قابض ہیں۔ یہ جنہیں چاہیں نواز دیں! یہی سبب ہے کہ گذشتہ دہائی میں ایسے ایسے نامعقول و مجہول ''ادب کے دھندے بازوں'' کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا گیا ہے کہ عقل حیران رہتی ہے۔

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ایک طرف انعامات و اعزازات کی منڈی ہے تو دوسری جانب اخبارات و رسائل کے ذریعے اپنے حواریوں کو استناد بخشنے کا مشن۔ یہ دھندہ ذرا زیادہ ہی چمکدار ہے۔ اس کی چمک سے اچھے اچھوں کی آنکھیں خیرہ رہ جاتی ہیں۔ اخبار و رسائل کے ذریعے ادبی قد آوری کے حصول کا طریقہ ذرا زیادہ مہذب اور آزمودہ ہے۔ دائروں میں بٹی اس کی پرتیں انتہائی مُبہم ہوتی ہیں جس کی تفہیم و تفسیر میں کافی مُدت صرف ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ ادب کا فرق کون کرے؟

اردو ادب کے پچاس۔ ساٹھ برسوں کا ایک اجمالی جائزہ یہ واضح

کرتا ہے کہ اعلیٰ ادب کو وقتی طور پر دبایا اور نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ سچائی سامنے آ ہی جاتی ہے۔ منٹو اور عصمت کے ساتھ یہی ہوا۔ لیکن افسوس ادب کے ان ڈیڑھ دنی مجاوروں کی سمجھ میں یہ بات قطعی نہیں آتی۔ وہ تو اپنے چاہنے والوں کو اپنی مکاری اور عیاری کے بل بوتے پر غالب اور اقبال بنانا چاہتے ہیں۔ تاریخ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ ایسا ناممکن ہے۔

وہ جو فرعونی اور ہامانی دبستانِ فکر سے وابستہ ہیں، ان کا نصب العین پل جھپکتے میں چاند کو مٹھی میں کرنا ہے۔ مگر ایسا نہ پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ اب ہوگا۔ کاغذ کے چمکیلے ٹکڑوں پر سنہرے حرفوں میں ''کاذبین'' کو ''صادقین'' لکھنے کا کام جاری ہے۔ بڑے بڑے سمینار ہو رہے ہیں۔ معیاری تحریریں مفقود ہیں۔ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ اچھی اور زندہ شاعری غائب ہے۔ تک بندیوں اور گلوبازیوں کا شہرہ ہے۔ موٹی موٹی کتابوں کی شکل میں کاغذ سیاہ کرنے کا عمل جاری ہے۔ زبان کی ترقی کے نام پر کروڑوں کا بجٹ ہے۔ ہندوستان میں سرکاری سطح پر نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ اردو ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری نئی نسل اردو سے نابلد ہے۔ اور ایسے شداد و نمرود جنہیں روٹی اردو کے حوالے سے ملتی ہے وہ بھی اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے!

یہ ہے اردو کے حوالے سے ہمارے عہد کا منظر نامہ!!

سوال یہ ہے کہ جب حق کی آواز، نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جائے تو بہتری و بلندی کی امید کہاں تک جائز ہے؟ کہا یہ جا رہا ہے کہ وہ لوگ جو وقت کے دھارے کو اپنے حق میں نہیں موڑ سکتے انہیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ اس خیال سے متفق ہو جائے لیکن وقت کا یہ سچ ہی آخری سچ تو نہیں ہے۔

جبر و ثقاوت اور ریشہ دوانیوں کے اس دور میں عباسی صاحب جیسے اردو کے ہمنوا و ہمدرد غنیمت ہیں جو حتی المقدور زبان کی ترقی میں خود بھی کوشاں ہیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔

شکر ہے کہ ظاہری چمک دمک سے دور ایک طبقہ اردو زبان و ادب میں ایسا بھی ہے جو بغیر کسی شور و غوغہ کے خاموشی سے گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ تو پی ایچ ڈی کے مقالے لکھ کر پیسے کماتے ہیں نہ لکچررشپ کی اسامیوں کا سودا کرتے ہیں، نہ دوسرے کے مضامین ترتیب دے کر اپنی کتابوں کے ڈھیر میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ یہ لوگ دینی مدارس میں تعلیم و تعلم سے وابستہ ہیں اور کہیں کہیں یہ لوگ دیگر پیشوں اور شعبوں میں ہیں،

اوراردو کو اپنے سینے سے لگائے آگے بڑھ رہے ہیں۔ایسے لوگوں کو نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلے کی پروا۔اردو کے ان قافلہ سالاروں کو سلام!

قومی زبان کہلانے والی زبان ہندی کی بھی کم و بیش اردو جیسی ہی حالت ہے۔وہاں بھی ادب و شعر کے محاذ پر سیاسی چالبازوں کا ہی دبدبہ ہے۔ اُن کی کتابیں بڑے طمطراق سے چھپتی ہیں اور پبلسٹی کی بنیاد پر بکتی بھی ہیں۔اور معیار کی بات تو یہ ہے کہ اردو سے بھی کم درجے کی کتابیں ہندی میں شائع ہوتی ہیں اور بکتی ہیں۔ ہندی شاعری کا معاملہ تو بالکل ہی دیگر گوں ہے۔وہاں تک بندیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ ہرا یرا غیرا وہاں اپنی تک بلندی کو کتابی شکل دینے پر مُصر ہے۔غزلیہ شاعری کے نام پر حالت مزید ابتر ہے۔نہ کوئی عروضی معاملہ کا پُرسانِ حال ہے نہ زبان و بیان کا۔ یہی سبب ہے کہ وہاں اعلیٰ درجے کی شاعری کا اردو کے شعری سرمایے کے مقابلے مزید فقدان ہے۔

زبانوں کی بات چل نکلی ہے تو تمل، ملیالم، تلگو، کنڑ، گجراتی، مراٹھی اور بنگالی ادب کا معیار بھی بلند ہے اور وہاں شائع ہونے والی کتابوں کی وقعت بھی قائم ہے۔ ہاں ادیبوں، شاعروں کی حالت انگریزی کے ادیبوں کے

مقابلے وہاں بھی بہتر نہیں ہے۔ اردو ہندی کے مقابلے سرکاری اکیڈمیاں بھی دیگر زبانوں کی گنتی کی ہیں کیونکہ وہ زبانیں ایک یا دو صوبے میں بولی جاتی ہیں جبکہ اردو ہندوستان کے سب سے زیادہ صوبوں میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ دوسرا نمبر ہندی کا ہے جسے بولنے اور سمجھنے والے ایک سے زیادہ صوبے میں موجود ہیں۔

دل کو تقویت دینے والی بات یہ ہے کہ اردو اپنی تمام تر نارسائیوں اور محرومیوں کے باوجود ملک کے کونے کونے میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے۔ اور ظالموں، جابروں کی تمام تر ریشہ دوانیوں کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اپنا وجود محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ یہ اس زبان کا طلسم بھی ہے اور اس کی سخت جانی بھی۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں عباسی صاحب جیسے فراخ دل انسان کی اردو دوستی اردو کے لئے فالِ نیک ہے۔ اردو زبان کو غیر اردو دانوں تک پہنچانے کے لئے عباسی صاحب مختلف سطحوں پر کام کر رہے ہیں۔ ایک سطح ہے ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی اور دوسرا محاذ ہے غیر اردو دانوں کو اردو کی تعلیم۔ مختلف تنظیموں اور ادبی انجمنوں کے ذریعے عباسی صاحب غیر اردو دانوں کو اردو پڑھانے کی ایک خاموش مُہم برسوں سے چلا رہے ہیں۔ اُن کی کوششوں سے

اب تک سینکڑوں لوگ مستفیض ہوئے ہیں۔ اپنی ان کوششوں کو وسعت دیتے ہوئے عباسی صاحب نے اپنے نایاب عباسی گرلز ڈگری کالج میں ''سرٹیفکٹ کورس اِن اردو'' کا سلسلہ بھی اس سال سے شروع کردیا ہے جس میں خواہشمند طالبات داخلہ لے رہی ہیں۔ دیہی پس منظر رکھنے والی ان طالبات کا یہ کہنا ہے کہ وہ بطورِ زبان اردو کی گرویدہ ہیں مگر اُنہیں پڑھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اب کالج میں اس سرٹیفکٹ کورس کی ابتدا ہوئی ہے تو وہ ذوق وشوق کے ساتھ اردو سیکھ رہی ہیں۔ اُنہیں زبان کا لُطف آرہا ہے۔ بعض طالبات کا کہنا تھا کہ اگر ہم لوگ اردو نہیں سیکھتے تو ساری زندگی زبان کو ''جبان'' اور غزل کو ''گجل'' کہتے رہتے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ عباسی صاحب نے یہاں اردو مرکز قائم کیا ہے جس کے تحت ہم دو تین مہینے میں اردو سیکھ لیں گے اور پھر ہمیں اردو شاعری اور ادب پڑھنے کا موقع ملے گا۔ آج تک ہم لوگ مہدی حسن، غلام علی اور جگ جیت سنگھ کی غزلیں سنتے تھے لیکن پوری طرح اس کا لطف نہیں لے پاتے تھے۔ اب ہم اُن غزلوں کو سمجھنے لگے ہیں۔

عباسی صاحب کا ذہن ہر قسم کی لسانی عصبیت سے پاک ہے۔ وہ کسی بھی زبان کے مخالف نہیں ہیں لیکن اردو سے اُنہیں خصوصی دلچسپی اور لگاؤ ہے۔

وہ اپنے اردو مرکز کو مزید مستحکم و فعال بنانا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے وہ مختلف اسکیمیں بنا رہے ہیں۔ بہت جلد ہی اُن اسکیموں کو عملی شکل دے دی جائے گی۔

کوڑی سے کروڑ تک

مسٹر عباسی کی کوڑی سے کروڑ تک کے سفر کی داستان نہایت تحیُّر خیز
ہے۔ قدم قدم پر آنے والی پریشانیوں کا جس طرح انہوں نے سامنا کیا وہ

دوسروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوسکتا ہے۔سن چھیاسٹھ۔سڑسٹھ میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ دہلی واقع حوض رانی میں رہتے تھے۔اور انڈین ایر لائنز کے کناٹ پلیس واقع دفتر میں ملازم تھے۔نوکری تو وہ کرتے تھے لیکن صرف ملازمت سے ہونے والی آمدنی پر قناعت کر کے بیٹھ جانا اُنہیں پسند نہیں تھا۔اُن کی ذہنی بلند پروازیاں اُنہیں مضطرب رکھتی تھیں۔وہ کچھ اور کرنا چاہتے تھے۔اپنی سطح پر ہاتھ پاؤں بھی مار رہے تھے لیکن کوئی مناسب راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ایسی راہ جس پہ چل کر وہ خود اپنی منزل تعمیر کرسکیں۔وہ دوسروں کی طرح کیسے ہوتے؟

ع کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اسی اثناء میں ان کے بھائی حفیظ عباسی نے دہلی کے لودھی روڈ واقع اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے ٹیلرنگ کا کام سیکھنا شروع کیا۔ذہانت کی دولت سے قدرت نے نوازا تھا اس لئے وہ بہت جلد اس فن میں طاق ہوگئے۔ پھر مسٹر حفیظ عباسی نے ایک دن گھر میں ذکر کیا کہ کناٹ پلیس واقع راجستھان ایمپوریم سے کُرتے سلائی کے لئے دیئے جاتے ہیں اور اس میں فی کرتا آٹھ آنے کی آمدنی ہوتی ہے۔مختلف گھروں کی متعدد خواتین یہ کام کر رہی ہیں۔اس

کام کی تفصیل سن کر مسٹر نفیس عباسی نے راجستھان ایمپوریم سے رابطہ پیدا کرنے کی ٹھانی۔ اپنی زندگی کے ان پُر مصائب وحساس ترین دور کا ذکر کرتے ہوئے آج مسٹر عباسی کے چہرے پر ایک انوکھی چمک دکھائی دیتی ہے۔ تقریباً چالیس برس قبل کے جدوجہد کی مکمل داستان آج بھی ان کے ذہن میں تروتازہ ہے۔ وہ کہتے ہیں مجھے جب یہ پتہ چلا کہ راجستھان ایمپوریم سے سلائی کے لئے کپڑے دیئے جاتے ہیں اور بعض لوگ سلائی کا ٹھیکہ لیتے ہیں اور سلائی کر کے اُنہیں لوٹاتے ہیں جس میں انہیں ٹھیک ٹھاک منافع ہوجاتا ہے۔ تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی ایسی کوشش کروں۔ میرے تجارتی ذہن نے مجھے راہ دکھائی اور میں ہمت کر کے راجستھان ایمپوریم پہنچ گیا۔ اور وہاں معلومات حاصل کرنی شروع کیں۔ وہاں موجود خاتون نے میری ظاہری ہیئت دیکھتے ہوئے پہلے تو ٹال مٹول کا رویہ اپنایا۔ لیکن میرے اصرار پر مجھے تھوڑا بہت کام دینے پر راضی ہوگئیں۔ انہوں نے ابتدا میں تھوڑا سا مال دیا اور کہا کہ اگر میں بروقت اور بہتر کارکردگی دکھاؤں تو وہ مزید کام دیں گی۔ میں نے اُسے ایک چیلنج کے طور پر لیا اور کپڑوں کا بنڈل لے کر گھر پہنچا۔ یوں شروع ہوگیا سلائی کا کام۔ محنت تو بہرحال کرنی تھی اور سینا بھی تھا بہت کچھ کرنے کا۔ لہٰذا

میں، میری شریکِ حیات، امّی جان اور بہنیں بھی اس کام میں لگ گئیں۔ ایک طرح یہ پوری فیملی کا روزگار ہوگیا۔ ہوتا یہ تھا کہ میں کپڑے سلنے کے بعد تین چار بنڈل لے کر چل پڑتا اور خالی بس میں ڈال دیتا۔ چلنے کے وقت جب کنڈکٹر بس میں داخل ہوتا تو کپڑوں کے یہ بنڈل دیکھکر چراغ پا ہو جاتا۔ خوب چیختا چلاتا۔ گالی گلوچ کرتا اور پھر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتے دیکھ کر خاموش ہو جاتا۔ اور میں یہ سارا نظارہ آنکھوں سے دیکھتا۔ اُس کی چیخ پکار اور مغلظات برداشت کرتا۔ مگر چپ رہتا۔ مجھے ایک عدد شرٹ کی تیاری پر محض چار آنے بھی نہیں بچتے لہٰذا مجبوری تھی بس میں ڈھونے کی۔ مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر ایک موقع ایسا آیا جب میں نے اپنے کام کے طریقۂ کار اور اس کے نتائج پر غور خوض شروع کیا۔ پتہ چلا کہ اتنا خون پسینہ ایک کر کے بھی منافع کچھ خاص نہیں تھا۔ بڑا معمولی منافع تھا۔ مسٹر عباسی کی زندگی میں ہر موڑ پر پیچھے مُڑ کر اپنا احتساب کرنے کی عادت اُنہیں ہمیشہ اپنی رفتار بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ اور وہ پہلے کے مقابلے زیادہ تیزی سے آگے بڑھے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ اس نہج پر چل کر بزنس کا تجزیہ کرتے ہیں اور یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ انہیں یہ کام نہیں کرنا ہے بلکہ اور کچھ کرنا ہے۔ اسی سوچ نے انہیں بازار کے

اتار چڑھاؤ کو سمجھنے میں مدد دی۔ وہ کام جو اُنہوں نے راجستھان لیمپو ریم سے شروع کیا تھا خوب پھولا پھلا اور پھر اُنہیں سوجھی دوسری برآمدات کرنے والی کمپنیوں کے لئے کام کی یہ سلسلہ بھی چل نکلا۔ سلائی کے میدان میں برسوں بتانے کے بعد اُنہوں نے فیصلہ کیا سیدھے برآمدات کے میدان میں اُترنے کا۔ اُن کا یہ فیصلہ بہت ہی کامیاب رہا اور دھیرے دھیرے ایک کامیاب ایکسپورٹر بنتے گئے۔ کوڑی سے کروڑ تک کا یہ سفر بڑا ہی کانٹوں بھرا رہا ہے۔ لیکن اس پوری داستان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ عباسی صاحب نے بُرے سے بُرے حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری اور حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا نتیجہ دنیا کے سامنے ہے۔ آج کی تاریخ میں وہ ایک کامیاب ایکسپورٹر بھی ہیں اور سماجی کارکن بھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں بھی اُن کی ایک الگ پہچان وجود پذیر ہے۔

''کالج ڈے'' کی تقریب میں عباسی صاحب کی والدہ بتول فاطمہ مرحومہ، بہو
رینا عباسی اور مشہور روحانی پیشوا مولانا زبیر صاحب بھی اسٹیج پر تشریف فرما ہیں۔

ظوہا میر کے ساتھ۔

بیگم کے ساتھ خوشگوار موڈ میں۔

ایک تقریب میں بیگم عباسی اور اُن کے صاحبزادے جناب فیروز عباسی دیکھے جا سکتے ہیں۔

صدرِ جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے۔ ساتھ میں جناب سراج قریشی و جناب سید فاروق بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اتحادِملت کے ایک پرگرام میں سماجی وسیاسی قائدین کے ساتھ۔

سابق وزیراعظمِ ہند آنجہانی راجیو گاندھی کے ساتھ نفیس عباس و بیگم نایاب فاطمہ عباسی۔

اپنی دختر شیبا میر کی شادی کے موقع پر سوٹ میں ملبوس نفیس عباسی۔

جانی مانی تعلیمی، ادبی وثقافتی ماہرین کے ساتھ کالج کے صحن میں نفیس عباسی۔
کالج کا معائنہ کرتے ہوئے۔

سابق وزیرِ ہند جناب عمر عبداللہ کے ساتھ امروہہ میں نایاب عباسی گرلز ڈگری

Nafees Abbasi

Kaudi Se Karod Tak

(A Biographical Sketch)

by

Khalid Raipuri

Treatment Publishers
New Bazaar, Bhopal, Madhya Pradesh (India)